ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان



سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

اسلام اور انسانی حقوق
سید جلال الدین عمری

اندلس میں حدیث کا تعارف اور اولین محدث
جناب محمد احمد زبیری

عہد نبوی اور خلافت اسلامی میں وصیت کی روایت
پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

مولانا شبلی کی سیرۃ النعمان اور اس پر معارضات
ڈاکٹر محمود حسن الٰہ آبادی

تذکرہ علمائے مالابار (چند ممتاز مصلحین امت)
پروفیسر احتشام احمد ندوی

بیویوں کے درمیان عدل کے ضوابط
ڈاکٹر محمد بن ناصر الحمید / مفتی مجاہد شبیر احمد

تعارف وتبصرہ
محمد جرجیس کریمی / محمد رضی الاسلام ندوی

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی
پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۱

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

اپریل جون ۲۰۰۷ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

پان والی کوٹھی، دودھ پور، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۱

Email: tahqeeqat_islami@yahoo.com, tahqeeqateislami@gmail.com

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد:۲۶ شمارہ:۲

ربیع الاول ۱۴۲۸ھ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ

اپریل جون ۲۰۰۷ء

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۲۵ روپے
سالانہ	۱۰۰ روپے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۱۲۵ روپے

بیرونِ ملک

سالانہ (انفرادی)	۴۰۰ روپے
سالانہ (ادارے)	۶۰۰ روپے

پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰۰ روپے
سالانہ (ادارے)	۳۰۰ روپے

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی-۶ سے چھپوا کر
ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

اسلام اور انسانی حقوق — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

اندلس میں حدیث کا تعارف اور اوّلین محدث — جناب محمد احمد زبیری — ۲۳

عہد نبوی اور خلافت اسلامی میں
وصیت کی روایت — پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی — ۳۵

بحث ونظر

مولانا شبلی کی سیرۃ النعمان اور اس پر معارضات — ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی — ۵۹

سیر وسوانح

تذکرہ علمائے مالابار (چند ممتاز مصلحین امت) — پروفیسر احتشام احمد ندوی — ۸۱

ترجمہ وتلخیص

بیویوں کے درمیان عدل کے ضوابط — ڈاکٹر محمد بن ناصر الحمید — ۹۷
مترجم: مفتی مجاہد شبیر احمد فلاحی قاسمی

تعارف وتبصرہ

اردو تفاسیر بیسویں صدی میں — مولانا محمد جرجیس کریمی — ۱۱۳

قرآن کریم میں معرّب الفاظ — محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۴

برِّصغیر ہند میں اشاعت اسلام کی تاریخ — ،، — ۱۱۵

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی — ،، — ۱۱۷

عظمت کے نشان — ،، — ۱۱۸

خبر نامہ ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی — ادارہ — ۱۱۹

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ جناب محمد احمد زبیری

نائب مدیر ماہ نامہ دعوہ، دعوہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

۲۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

ڈائرکٹر شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل، ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۳۔ ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی

۷۹/ چوتھا نظام پورہ، بھیونڈی، مہاراشٹر

۴۔ پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

سابق صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی، کیرلا

۵۔ ڈاکٹر محمد بن ناصر الحمید

استاذ شعبۂ فقہ، کلیۃ الشرعیۃ، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

۶۔ مفتی مجاہد شبیر احمد فلاحی قاسمی

اسکالر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۷۔ مولانا محمد جرجیس کریمی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۸۔ محمد رضی الاسلام ندوی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۹۔ سید جلال الدین عمری

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

اسلام اور انسانی حقوق

راقم نے 'اسلام اور انسانی حقوق' کے موضوع پر نومبر ۲۰۰۴ء میں ایک تقریر کی تھی، جو کتابچہ کی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہی تقریر یہاں حذف و اضافہ اور نظرِ ثانی کے بعد نئی شکل میں پیش کی جا رہی ہے۔ اس موضوع پر میری ایک مستقل کتاب 'اسلام - انسانی حقوق کا پاسبان' کے نام سے پہلے سے موجود ہے۔ اس مضمون میں اس کا ایک طرح سے خلاصہ آ گیا ہے۔ (جلال الدین)

انسانی حقوق کا تصور اور اس کی تاریخ

انسانی حقوق کے بارے میں یہ تصور دیا جاتا ہے کہ اس کا احساس جیسے آج ہے، اس سے پہلے نہیں تھا۔ انسانوں کی اکثریت اپنے بنیادی حقوق سے محروم تھی اور ظلم کی چکی میں پس رہی تھی۔ کبھی کہیں سے کوئی آواز اٹھتی بھی تو طاقت ور طبقات کے مضبوط ہاتھ اسے دبانے میں کامیاب ہو جاتے۔ اس کی آزادی کا صحیح معنوں میں احساس مغرب کو ہوا اور مغرب ہی نے اس کا واضح تصور دیا۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس کے الفانسو شاہ نہم نے یہ قانون منظور کیا یا اس سے منظور کرایا گیا کہ کسی کو بلا وجہ قید نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے لفظوں میں حبسِ بے جا کو کالعدم قرار دیا گیا۔ اسے انسانی حقوق کی تاریخ میں بہت بڑا اقدام سمجھا جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد فرانس ہی میں روسو پیدا ہوا، اس کی کتاب کا اور اس نے انسانی آزادی کا جو تصور دیا اس کا بڑا چرچا رہا۔ اس نے کہا کہ انسان فطرتاً آزاد ہے اور اسے آزاد ہونا چاہیے۔ اس کتاب کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا اور یہ بڑی انقلابی کتاب سمجھی گئی۔ اردو زبان میں بھی

اس کا ترجمہ 'معاہدۂ عمرانی' کے نام سے موجود ہے۔ اس کتاب کے بعد فرانس میں ایک طرح کی ہلچل پیدا ہوئی اور Declaration of Rights of the Man نامی اعلانیہ شائع ہوا، جس میں انسانی حقوق کا تذکرہ تھا۔

حقوقِ انسانی کا عالمی منشور

اس نوع کی اور بھی کوششیں جاری رہیں۔ ان کا عروج یہ تھا کہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ نے حقوقِ انسانی کا عالمی منشور (The Universal Declaration of Human Rights) منظور کیا اور اسے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اسے اس سلسلے کا بڑا انقلابی قدم سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انسانی حقوق کا بہت ہی صاف اور واضح تصور اس کے اندر موجود ہے اور انسانوں کو ظلم و زیادتی سے بچانے کی یہ ایک کامیاب کوشش ہے۔

اس منشور میں تین باتوں پر زور دیا گیا ہے:

(۱) فرد کی آزادی

(۲) عدل و انصاف

(۳) مساوات

قانون کے ماہرین کے نزدیک یہ اس اعلانیے کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ اگر یہ تینوں چیزیں انسان کو مل جائیں تو اس کے حقوق محفوظ ہو جاتے ہیں۔

اس منشور کی خامیاں

اس منشور میں بعض خامیاں بھی ہیں اور عملی رکاوٹ بھی ہے۔ ایک یہ کہ یہ منشور منظور تو ہو گیا، لیکن اس کے پیچھے کوئی قوتِ نافذہ نہیں ہے۔ اگر کوئی ملک خاص طور پر کوئی طاقت ور ملک اس کی خلاف ورزی کرے تو اسے اس کا پابند بنانے کی کوئی ٹھوس اور موثر تدبیر اس میں تجویز نہیں کی گئی ہے۔ اس کا ثبوت آپ آج کی دنیا میں دیکھ سکتے ہیں کہ ایک بڑا ملک اپنی طاقت کے نشہ میں پوری دیدہ دلیری کے ساتھ انسانی حقوق کی خلاف ورزی کر رہا

ہے اور کوئی اسے روکنے والا نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس میں مذہبی آزادی کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن اس آزادی کے صحیح معنوں میں حدود متعین نہیں ہوئے ہیں۔ فرض کیجیے کہ اگر مذہبی آزادی کا تصور صرف یہ ہے کہ آدمی پوجا پاٹ کرے، عبادت گھر میں جا کے اللہ کی عبادت کرے، مسجد میں نماز پڑھ لے، چرچ میں اپنے مذہب کے مطابق دعا میں شریک ہو جائے، گردوارے میں یا جس کی جو عبادت گاہ ہے اس میں پہنچ جائے اور عبادت کے مراسم بجالے آئے تو یہ بھی ایک آزادی ہے۔ اس سے آگے بعض نجی اور خاندانی معاملات میں آزادی دے کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مذہبی آزادی ہے۔ آج مذہبی آزادی کا اس سے زیادہ کوئی تصور فی الواقع ہے بھی نہیں، لیکن اسلام کے معاملے میں مشکل یہ ہے کہ وہ پوری زندگی کے بارے میں ہمیں ہدایات فراہم کرتا اور ان کی پابندی کا حکم دیتا ہے۔ ایسا کوئی دستور نہیں ہے جو یہ کہے کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے تمام احکام پر چلنے کی آزادی ہے اور وہ اپنے دائرے میں اپنا قانون نافذ کر سکتے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ مغرب میں کلیسا اور اس کے زیر اثر برسر اقتدار طبقہ نے انسان کی آزادیٔ فکر و عمل اور اس کے بنیادی حقوق کے سلسلے میں انتہائی غلط رویہ اختیار کیا جس کا صحیح مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے ردِّ عمل میں حقوق انسانی کا موجودہ تصور ابھرا۔ اس میں مذہب کے حقیقی رول کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اللہ کے جو پیغمبر دنیا کے مختلف گوشوں میں اور مختلف زمانوں میں آئے ان کی کیا تعلیمات تھیں، ان کو جب اقتدار ملا تو ان کا کیا رویہ رہا اور انسانیت کس طرح فلاح سے ہم کنار ہوئی ہے؟ یہ چیز کہیں زیر بحث نہیں آتی۔ جیسے یہ طے کر لیا گیا ہو کہ مذہب سے ہٹ کر یا مذہب کو نظر انداز کر کے گفتگو کی جائے گی۔ اس وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کوئی معروضی یا غیر جانب دارانہ مطالعہ ہے، صاف بات ہے کہ یہ جانب دارانہ مطالعہ ہے۔ جس میں پہلے سے طے کر لیا گیا ہے کہ مذہب کا حقیقی کردار زیر بحث نہیں آئے گا، بلکہ اسے نظر انداز کیا جائے گا۔

اسلام کا نقطۂ نظر

یہ ایک واقعہ ہے اور اسلام اسے تسلیم کرتا ہے کہ انسان پر ظلم و زیادتی ہوتی رہی ہے۔ انسانِ اوّل حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہی میں ایک بیٹے نے دوسرے بیٹے کا محض اس وجہ سے خون بہا دیا کہ اس کی قربانی اللہ کے دربار سے رد ہوگئی اور اس کے بھائی کی قربانی نے شرف قبولیت حاصل کرلیا۔ لیکن اس کا ضمیر زندہ تھا۔ اسے بعد میں اس پر ندامت بھی ہوئی۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المائدۃ: ۲۷-۳۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ظلم و زیادتی کو نہ روکا جائے تو ایک بھائی کے ہاتھ دوسرے بھائی کے خون سے رنگین ہوسکتے ہیں، اس لیے اسلام چاہتا ہے کہ ظلم و زیادتی کا ہر حال میں خاتمہ ہو اور کسی کو اس بات کی اجازت نہ ہو کہ وہ دوسرے کو جور و ستم کا نشانہ بنائے۔ اس کے لیے اس نے ایک جامع اور مکمل قانون پیش کیا ہے۔ اس سے عدل و انصاف کے تقاضے ہر پہلو سے پورے ہوتے ہیں اور انسان کو وہ تمام حقوق ملتے ہیں جو اسے فی الواقع ملنے چاہئیں اور جن کی ضرورت کل کی طرح آج بھی ہے۔ یہ قانون متمدن دنیا کے بڑے حصہ پر صدیوں تک نافذ رہا ہے اور دنیا اس کا کامیاب تجربہ کرچکی ہے۔

قرآن و حدیث میں انسانی حقوق کا بیان

قرآن مجید میں احکام و قوانین کا ذکر مروجہ قانون کی زبان میں نہیں ہے۔ قانون کی کتابوں کی طرح ان میں ابواب اور دفعات کی شکل میں قوانین نہیں بیان ہوئے ہیں، بلکہ حالات کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً ان کا نزول ہوتا رہا ہے اور اسلام کی اساسی تعلیمات کے درمیان یہ پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ان میں سے کسی قانون کا بالعموم ایک جگہ بیان نہیں ہے، بلکہ اس کے ایک پہلو کا ایک جگہ اور دوسرے پہلو کا دوسری جگہ ذکر ہے۔ ان سب کو سامنے رکھنے سے قانون کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔ یہی طریقہ اس نے انسانی حقوق کے بیان میں اختیار کیا ہے۔ پھر احادیث میں ان کی تفصیلات ملتی ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس قانون پر کس طرح عمل ہوا۔ احادیث قرآن مجید کی سب سے مستند تشریح ہیں۔ احادیث

سے ہمیں بعض نئے قوانین کا بھی علم ہوتا ہے۔

فقہاء کی تشریحات

اس کے ساتھ اسلامی قانون کی توضیح وتشریح کی علمائے امت نے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی قانونی وفقہی بصیرت کا انکار نادانی اور بے خبری کی دلیل ہوگی۔ انھوں نے جس ژرف نگاہی کے ساتھ اسلامی قانون کا مطالعہ اور تحقیق کی ہے اس کی نظیر آسانی سے نہیں پیش کی جاسکتی۔ متنِ قانون کے ایک ایک پہلو اور اس کے ایک ایک لفظ پر ان کے یہاں جو مباحث موجود ہیں اس سے قانون کے مختلف گوشے سامنے آتے ہیں اور قانونی دشواریوں کے حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

اسلامی قانون پر اعتراضات

آج غیر جانب داری اور عدم تعصب کا چرچا تو بہت ہے، لیکن اسلام نے انسان کو جو حقوق دیے ہیں ان کا صحیح معنی میں اعتراف نہیں ہوتا۔ ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ آج انسان فکر ونظر اور تہذیب وتمدن کے لحاظ سے جس مقام پر پہنچ چکا ہے، صدیوں پرانا قانون اس کے تقاضے پورے نہیں کرسکتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلامی قانون کے ذریعہ بہت سے معاملات میں عدل وانصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ لیکن یہ باتیں کسی تحقیق اور گہرے غور وفکر کا نتیجہ نہیں ہیں۔ اسلام کی اساسی تعلیمات اور اس کا پورا نظام فکر وعمل ان کی تردید کرتا ہے۔ اسلامی قانون کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آج جن حقوق کا چرچا ہے اور جن کے حصول کے لیے جدوجہد اور کشمکش جاری ہے، اسلام نے بہت پہلے ان حقوق کا واضح تصور ہی نہیں دیا، بلکہ ان کے لیے قانونی ضمانت فراہم کی۔ انسان کے کسی ایسے بنیادی حق کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی جو اسلامی قانون نے اسے نہ دی ہو۔ یہ سب کچھ ان حالات میں ہوا کہ معاشرہ کے طاقت ور افراد کو ہر طرح کے حقوق حاصل تھے اور کم زور کا کوئی حق نہ تھا۔ اس کے لیے کم زور کو کوئی جنگ یا کش مکش نہیں کرنی پڑی، بلکہ اسلام نے خود سے یہ حقوق اسے فراہم کیے۔

بعض راہ نما اصول

اسلام نے انسان کو جو حقوق دیے ہیں ان پر گفتگو سے پہلے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس کائنات اور انسان کے بارے میں اس کا ایک خاص نقطۂ نظر ہے۔ اس کی بنیادی اہمیت ہے۔ اس کی بعض اصولی تعلیمات ہیں، جن سے وہ کسی قیمت پر ہٹتا نہیں اور اس کا کوئی قانون ان تعلیمات سے ٹکراتا نہیں ہے۔ اگر آپ کوئی قانون وضع یا نافذ کریں تو آپ کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ وہ ان بنیادی تعلیمات سے متصادم نہ ہو۔ اگر وہ ان سے متصادم ہے تو اسلامی قانون نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے کہ اس دنیا کا خالق و مالک اللہ ہے، ہر چیز اس کی ملکیت ہے۔ یہ اس کا ایک بنیادی تصور ہے۔ اس تصور نے ہر ظالم اور جابر کا اقتدار ختم کر دیا ہے اور اسے بتا دیا ہے کہ تم مالک نہیں ہو، مالک تو اللہ ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو اس حیثیت سے تسلیم کرتا ہے تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاس اقتدار ہے، میں بادشاہِ وقت ہوں، کسی بڑی جائیداد اور پراپرٹی کا مالک ہوں، لینڈ لارڈ یا صنعت کار ہوں یا میری کوئی اور حیثیت ہے، اس لیے جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ جب اصل مالک اللہ ہے تو انسان اس کی ملکیت میں اس کی مرضی ہی کے مطابق تصرف کر سکتا ہے۔ اللہ کی عطا کردہ قوت و طاقت یا وسائل و ذرائع کو اس کی مرضی کے خلاف یا اس کے بندوں پر ظلم و زیادتی کے لیے استعمال نہیں کر سکتا۔ ایک اور مثال لیجیے۔ خدا کے بارے میں اسلام کے عقیدے کا ایک لازمی جزو یہ ہے کہ موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جب تک چاہتا ہے انسان دنیا میں رہتا ہے اور جب اس کی مرضی ہوتی ہے وہ چلا جاتا ہے۔ بعض بچے ماں کے پیٹ ہی میں مر جاتے ہیں۔ کوئی پیدا ہوتے ہی مر جاتا ہے۔ کوئی جوان ہو کے مرتا ہے، کوئی بوڑھا ہو کر مرتا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا کہ کوئی آدمی اس دنیا میں کب تک زندہ رہے گا، اللہ کا کام ہے۔ اس سے زندگی سلب کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ وہ ایسا کرتا ہے تو اللہ کے اقتدار میں دخل دیتا ہے اور اسے اس کی سزا ملے گی۔ اسی طرح وہ کہتا ہے کہ انسان صرف ایک خدا کا بندہ ہے اور اسے بندہ ہی بن کر رہنا ہوگا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس میں اس بات کا اعلان ہے کہ انسان پر حکومت صرف اللہ کی ہونی چاہیے، کسی دوسرے کو اسے غلام

بنانے کا حق نہیں ہے۔ اور ہر اقتدار کو اللہ کے اقتدار کے تابع ہونا چاہیے۔ اس سے آزاد ہو کر کسی انسان پر دوسرے انسان کا مذہبی اقتدار جائز ہے نہ سیاسی اقتدار۔ اسی طرح قرآن کہتا ہے کہ انسان محترم ہے۔ اس احترام کے بہت سے پہلو ہیں۔ اسے اس کے فطری حقوق سے محروم کرنا اس احترام کے منافی ہے۔ اگر انسان کو ذلیل کیا گیا تو وہ محترم نہیں رہا، ذلیل ہوا۔ قرآن مجید اس کے خلاف ہے۔ اسی طرح اسلام کے نزدیک قانون دینے کا حق صرف اللہ کو ہے اور انسان اس قانون کا پابند ہے۔ ہاں اس کے عطا کردہ قانون کی روشنی میں وہ حالات کے لحاظ سے اجتہاد کرسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کسی فرد یا جماعت کو مطلق فرماں روائی کا حق حاصل نہیں ہے۔ اللہ کے قانون کے حاکم اور محکوم دونوں ہی پابند ہوں گے۔ یہ اس کے بعض بنیادی تصورات ہیں۔ دنیا کے ہر دستور میں تمہیدی باتیں یا رہنما اصول ہوتے ہیں۔ اسلام کے اساسی تصورات کو راہنما اصول کہا جاسکتا ہے۔ ان سے انسانی حقوق کا متعین تصور ابھرتا ہے اور ایک خاص رُخ اختیار کرتا ہے۔

اسلام نے صرف قانون ہی نہیں دیا ہے، بلکہ وہ آگاہ کرتا ہے کہ اگر اس قانون پر عمل نہ ہو تو اللہ کے یہاں اس کی گرفت ہوگی۔ وہ آخرت کا خوف پیدا کرتا ہے، جس کی وجہ سے قانون کے احترام اور اس کی پابندی کا جذبہ آدمی کے اندرون سے ابھرتا ہے۔ آخرت پر یقین ہو تو انسان اللہ کے قانون کی خلاف ورزی آسانی سے نہیں کرسکتا۔

حقِ حیات

انسان کے حقوق شخصی، ذاتی، سماجی، معاشی، سیاسی کئی طرح کے ہیں جو اسے لازماً ملنے چاہئیں۔ ان میں اس کا اولین اور بنیادی حق یہ ہے کہ اسے زندہ رہنے دیا جائے۔ قرآن مجید کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہے کہ اس نے اس حق کو کتنی اہمیت دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر انسان جو خدا کی اس زمین پر پیدا ہوتا ہے اسے زندہ رہنے کا حق ہے۔ بعض لوگ اس کے اس حق کو پامال کررہے تھے، اس نے ان کے خلاف آواز بلند کی۔ جو لوگ معاشی، سماجی، مذہبی یا کسی بھی وجہ سے انسان کی جان کا احترام نہیں کررہے

تھے قرآن نے ان کو چیلنج کیا۔ اس نے کہا کہ کسی کو کسی کی زندگی چھیننے کا حق ہی حاصل نہیں ہے۔ قانون کے ماہرین کہتے ہیں کہ کوئی حق مطلق (Absolute) نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ شرائط ہوتے ہیں اور اس میں استثنا بھی ہوتا ہے۔ قرآن نے صاف الفاظ میں اس کی وضاحت کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی جان بے شک محترم ہے، لیکن حق و انصاف کا احترام اس سے زیادہ ضروری ہے۔ لہٰذا حق وانصاف کا تقاضا ہو تو انسان کی جان لی بھی جاسکتی ہے۔ بعض جرائم وہ ہیں جن کے ارتکاب کے بعد وہ اپنا حق حیات کھو دیتا ہے۔ وہ اللہ کے نیک بندوں کا ایک وصف یہ بیان کرتا ہے۔

وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (الفرقان:۶۸)

وہ انسانی جان کو جسے اس نے محترم قرار دیا ہے قتل نہیں کرتے مگر حق کے ساتھ۔

مطلب یہ کہ حق وانصاف کا تقاضا ہو تو اللہ کے نیک بندے انسان سے اس کا حق حیات چھین لیتے ہیں، لیکن اگر حق وانصاف اجازت نہ دے تو کسی بھی شخص کو خواہ وہ وقت کا بادشاہ اور مملکت کا فرماں روا ہی کیوں نہ ہو، یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ کسی کو اس کے زندہ رہنے کے حق سے محروم کردے۔

حقِ مساوات

انسانی حقوق پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں مساوات کو تمام اجتماعی حقوق کی اساس قرار دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی تصور سے تمام حقوق نکلتے ہیں کہ سارے انسان مساوی حیثیت کے مالک ہیں۔ ان میں عورت، مرد، بڑے، چھوٹے، امیر، غریب، مالک اور مزدور سب کا درجہ ایک ہے۔ ان میں رنگ و نسل، وطن، علاقے، جنس اور صنف کی بنا پر کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام نے مساوات کی یہ آواز جتنے زوردار طریقے سے اٹھائی، اس سے زوردار آواز اٹھائی نہیں جاسکتی۔ قرآن کی آیات اس سلسلے میں معروف ہیں۔ حجۃ الوداع کے موقعے پر رسول اللہ نے جو بے نظیر خطبہ دیا، جسے انسانی حقوق کا اولین منشور کہیں تو بے جا نہ ہوگا، اس میں آپ نے فرمایا:

لا فضل لعربی علیٰ عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقویٰ (مسند احمد، ۵/۴۱۱)

نہ تو عربی کو عجمی پر اور نہ عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر کوئی فضیلت ہے، الاّ یہ کہ (کسی میں) تقویٰ ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں سب سے پہلے عرب کا ذکر فرمایا۔ اس لیے کہ عربوں کے ذریعے اسلامی انقلاب آیا تھا۔ عرب اس وقت تختِ حکومت پر فائز اور فرماں روا تھے۔ ان سے کہا گیا کہ یاد رکھو کسی عربی کو کسی عجمی پر فوقیت نہیں ہے اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ 'الا بالتقویٰ' کا مطلب یہ ہے کہ برتری تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر کسی کے اندر تقویٰ ہے تو وہ افضل ہے، اس کا احترام ضرور ہونا چاہیے اور سوسائٹی میں اس کی عزت و توقیر ہونی چاہیے۔ اس کی جگہ یہ دیکھنا کہ کون گورا ہے، کون کالا، کون عربی ہے اور کون عجمی، کس کا کس ملک سے تعلق ہے اور کون مرد ہے اور کون عورت ہے، ناجائز اور غیر اسلامی رویہ ہے۔ یہ اعلان اس وقت ہوا جب دنیا میں مساوات کا واضح تصور تک نہیں پایا جاتا تھا۔

حقِ انصاف

انسان کا ایک بنیادی حق یہ مانا جاتا ہے کہ اسے عدل و انصاف حاصل ہو۔ اس معاملے میں اسلام کا موقف بہت واضح ہے۔ وہ پوری امت مسلمہ کو عدل و انصاف کی علم بردار کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اسے حکم ہے کہ ہر فرد کے ساتھ بے لاگ انصاف کرے اور دشمن کے ساتھ بھی عدل و انصاف کی روش پر قائم رہے اور کسی بھی معاملے میں ناانصافی کا رویہ نہ اختیار کرے، اس لیے کہ یہ تقویٰ اور خدا ترسی کے سراسر خلاف ہے۔ عدل و انصاف کے خلاف قدم اٹھاتے ہوئے آدمی کو خدا کی پکڑ سے بچنا چاہیے اور اسے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اللہ کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ (ملاحظہ ہو: المائدۃ: ۸)

قانون کی برتری

مساوات اور عدل و انصاف کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ معاشرے میں

قانون کو برتری حاصل ہو، تاکہ ہر شخص اس اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکے کہ قانون اس کی پشت پر ہے اس لیے اس کے ساتھ کوئی ناانصافی یا اس کی حق تلفی نہ ہوگی۔ یہ بات اس طرح کہی جاتی ہے جیسے اس سے پہلے دنیا میں اس کا تصور ہی نہیں تھا۔ اسلام نے یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ کہی ہے کہ قانون کے سامنے سب برابر ہیں۔ اس کے مقابلے میں کسی کو دم مارنے کی اجازت نہ ہوگی۔ مشہور واقعہ ہے جو صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں موجود ہے کہ بنومخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو نبی اکرم ﷺ سے درخواست کی گئی کہ اس عورت نے چوری کی ہے، لیکن شریف گھرانے کی ہے، اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے، کوئی اور سزا دے دی جائے۔ نبی ﷺ کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ آپ نے فرمایا کہ قومیں اسی طرح تباہ ہوئی ہیں کہ ان میں جو بااقتدار اور شریف سمجھے جاتے تھے انھوں نے اگر کوئی غلط کام کیا تو ان کو سزا نہیں دی گئی اور جو کم زور تھے ان کو سزا دی گئی۔ پھر اس کے بعد وہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا جو شاید پیغمبر ہی کی زبان سے نکل سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو آج میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ (متفق علیہ) مطلب یہ کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ یہ بڑے کے لیے بھی ہے چھوٹے کے لیے بھی، مرد کے لیے بھی ہے اور عورت کے لیے بھی۔ اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ اتنا صاف اور واضح تصور ہے کہ قانون کی برتری کا اس سے بہتر اور واضح تصور پیش نہیں کیا جا سکتا۔

جرم عدالت سے ثابت ہوگا

کہا جاتا ہے کہ انصاف کے لیے ضروری ہے کہ جرم عدالت سے ثابت ہو۔ اس کے بغیر سزا نہ دی جائے۔ یہ تصور بھی شاید اسلام ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

واللہ لا یوسر رجل فی الاسلام بغیر العدول (موطاامام مالک، کتاب الشہادات، باب ماجاء فی الشہادات)	قسم خدا کی کسی شخص کو قید نہیں کیا جائے گا جب تک کہ عادل لوگ اس کے مجرم ہونے کی گواہی نہ دیں۔

اسلام کے نزدیک ریاست کی ذمے داری ہے کہ وہ دیکھے کہ قانون کہیں مجروح تو نہیں ہو رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

الامام راع وھو مسئول عن رعیتہٖ (متفق علیہ) — امام نگراں ہے۔ اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔

راعی چرواہے اور نگراں کو کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ جس طرح ایک چرواہا بکریوں کے ریوڑ کا ذمے دار ہوتا ہے اسی طرح امام بھی اپنی رعیت کا ذمے دار ہے۔ اس کی حیثیت کسی مطلق العنان بادشاہ یا جابر و قاہر حاکم کی نہیں بلکہ چرواہے کی ہے، جو یہ دیکھتا رہتا ہے کہ کہیں کسی پر ظلم تو نہیں ہو رہا اور اس کے ساتھ ناانصافی تو نہیں ہو رہی ہے۔ ریاست کا فرض ہے کہ اس بات کی نگرانی کرتی رہے کہ کسی کا حق ضائع نہ ہونے پائے اور اسے کسی پہلو سے نقصان نہ پہنچے۔

معاشی جدوجہد کا حق

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ انسان کو اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کا حق ملنا چاہیے۔ اسلام کا نقطۂ نظر اس معاملے میں بالکل واضح ہی نہیں بہت وسیع ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پوری زمین میں انسانوں کی معیشت کا ساز و سامان پھیلا ہوا ہے۔ اس سے سب ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (الاعراف:۱۰) — ہم نے تمھیں زمین میں اقتدار دیا اور اس میں تمھارے لیے معاش کے سامان رکھ دیے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی اس زمین میں جو اسبابِ معاش ہیں ان سے فائدہ حاصل کرنے کا ہر ایک کو حق ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ (الملک:۱۵) — زمین کے کناروں پر چلو اور اللہ نے اس میں جو رزق رکھا ہے اسے کھاؤ۔

اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ زمین کے ہر گوشے پر تمھیں پہنچنے اور اللہ نے جو رزق رکھا

ہے اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔ اسلام کے نزدیک حصولِ معاش میں کوئی ناجائز رکاوٹ قانوناً جرم ہے۔ اسلام انسان کو معاشی جدوجہد کی آزادی فراہم کرنے کے ساتھ اس بات کو بھی یقینی بناتا ہے کہ انسان کو اچھی غذا ملے۔ وہ گندی غذا استعمال کرنے اور گلی سڑی چیزیں کھانے پر مجبور نہ ہوجائے۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کا انسان پر یہ احسان ہے کہ اسے طیبات دی گئی ہیں۔ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اسے طیب اور پاک صاف غذا ملنی چاہیے۔ یہ اس کا ایک بنیادی حق ہے۔ اس کے نزدیک لباس بھی انسان کی ایک فطری ضرورت ہے۔ آدم علیہ السلام جب ننگے ہوگئے تو انھوں نے کہا کہ اے اللہ میں ننگا ہوگیا ہوں۔ کچھ نہیں ملا تو درخت کے پتوں ہی سے خود کو چھپانے لگے۔ اسلام کی رو سے انسان کی یہ فطری ضرورت لازماً پوری ہونی چاہیے۔ اسی طرح اسے مکان ملنا چاہیے اور حسب سہولت اس کے پاس خادم بھی ہونا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو ہم سرکاری خدمت پہ لیں گے اگر اس کی شادی نہیں ہوئی ہے تو اس کو یہ حق ہے کہ بیت المال سے شادی کے اخراجات لے، اپنے لیے کپڑے کا انتظام کرے۔ وہ اپنے لیے مکان بھی بنا سکتا ہے اور سواری بھی رکھ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کا حق اس کو نہیں ہوگا۔ علمائے کرام نے لکھا ہے کہ اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ ریاست کی معاشی حالت کیا ہے؟ بہرحال اسلامی ریاست یہ ذمے داری لیتی ہے کہ کوئی شخص بھوکا پیاسا نہ رہے اور یہ سوچنے پر مجبور نہ ہوجائے کہ اب میرا کوئی پوچھنے والا نہیں رہا۔ صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ **من ترک مالا فلورثتہ** یعنی کوئی شخص اس حال میں دنیا سے جا رہا ہے کہ اس نے مال چھوڑا ہے تو یہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔ **و من ترک عیالا فإلیَّ انا ولی من لا ولی لہ** لیکن اگر کوئی بال بچے چھوڑ کر جاتا ہے اور مال چھوڑ کر نہیں جاتا ہے تو اس کا ولی میں ہوں گا اور اس کی نگہ داشت میرے ذمے ہے۔ (مسند احمد، ۴/۱۳۳) اس کے سلسلے میں علماء نے لکھا ہے کہ یہ ریاست کی ذمے داری ہے کہ کسی بھی بچے اور کسی بھی فرد کی ضروریات پوری ہونے سے نہ رہ جائیں۔ خاندان میں اس کا کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے تو ریاست اس کی ضروریات پوری کرنے کی ذمے دار ہوگی۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ انسان دنیا کو مقصود نہ بنائے۔

سماجی حقوق

حقوق کے ذیل میں سماجی و معاشرتی حقوق کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ اسے لازماً ملنے چاہئیں۔ سماجی اور معاشرتی حقوق کا تصور یہ ہے کہ آدمی سماج اور معاشرے میں فعّال کردار (Active Part) ادا کر سکے۔ یہ اس کا حق ہے کہ اسے بے کار یا عضو معطل بنا کے نہ رکھ دیا جائے۔ اس پر ایسی پابندیاں نہ ہوں کہ وہ کچھ نہ کر سکے۔ اسلام میں اس کا تصور بالکل واضح ہے۔ اسلام فکر و عمل کی آزادی کا قائل ہے۔ جو لوگ غور و فکر نہیں کرتے ان کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ انھیں کیا ہو گیا ہے کہ جانوروں کی طرح بے سوچے سمجھے زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ دنیا کے آغاز و انجام پر غور کریں اور سمجھیں۔ عمل کی بھی وہ پوری آزادی دیتا ہے البتہ ہر شخص کو اس بات کی پابندی ضرور کرنی ہوگی کہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے، جس سے فساد پھیلے اور معاشرہ کو نقصان پہنچے۔ پیغمبروں کی دعوت کی اولین بنیاد توحید ہوتی تھی، یعنی یہ کہ اللہ واحد کی عبادت کی جائے۔ پھر وہ کہتے تھے:

لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (الاعراف:۸۵) — زمین میں اصلاح کے بعد بگاڑ نہ پیدا کرو۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنے قانون کو اصلاح کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس کی موجودگی میں فساد برپا نہ کرو۔

اظہارِ خیال کی آزادی

اظہار خیال کی آزادی انسان کا ایک بنیادی حق ہے۔ اسلام نے اسے یہ حق عطا کیا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کے اس حق پر ناروا پابندی نہیں لگنی چاہیے، لیکن وہ اس بات کا اسے پابند بناتا ہے کہ اظہارِ خیال کے نام پر وہ بے حیائی نہ پھیلائے، کسی کی دل آزاری نہ کرے، کسی کا مذاق نہ اُڑائے، کسی کی عزت و آبرو سے نہ کھیلے اور ملک و ریاست کو خطرے میں نہ ڈالے اور اس کے خلاف سازش نہ کرے۔ ان شرائط کے ساتھ اسے اظہار رائے کی آزادی ہے۔ دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو اس پر اس نوعیت کی پابندی نہ لگاتا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ آج بہت ساری چیزوں کا شمار بے حیائی میں نہیں ہے۔ اسے اس کی

چھوٹ حاصل ہے۔

خاندانی زندگی گزارنے کا حق

یہ بھی انسان کا ایک حق سمجھا جاتا ہے کہ اسے خاندان بسانے کی اجازت ہو۔اس لیے کہ خاندان انسان کی ایک فطری ضرورت ہے۔اس معاملے میں اسلام کی تعلیمات اتنی واضح ہیں کہ اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔وہ کہتا ہے کہ خاندان خدا کا عطیہ اور انعام ہے۔آدمی کے بچوں اور پوتوں کا پھیلنا اس کے لیے زحمت نہیں، بلکہ باعثِ رحمت ہے۔خاندان کے سلسلے میں اس سے بڑی بات اور کیا کہی جاسکتی ہے؟ پھر یہ کہ اس نے خاندان کا پورا سسٹم دیا ہے اور اسے باقی رکھنے کی تاکید کی ہے۔

خلوت کا حق

تنہائی اور خلوت (Privacy) کو بھی انسان کا ایک حق تسلیم کیا گیا ہے۔قرآن نے نہ صرف یہ کہ یہ حق دیا ہے، بلکہ اس کی تاکید کی ہے کہ کسی کی نجی زندگی میں مداخلت نہ کی جائے، یہاں تک کہ حکومت کو بھی اس میں مداخلت کا حق نہیں ہے۔

ملکی وملّی خدمات کا حق

یہ بھی انسان کا ایک بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے اور اسلام میں یہ حق پہلے سے موجود ہے کہ انسان کو ملک وملت کی خدمت اور تنقید واصلاح حال کا موقع ملنا چاہیے۔ اسلام نے انسان کو یہ حق فراہم کیا ہے اور بتایا ہے کہ جو انسان ملک کی خدمت کرتا ہے وہ سماج کا بہترین اور قابل قدر انسان ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قوی مومن ضعیف مومن سے بہتر ہے۔'' (صحیح مسلم، کتاب القدر، باب الایمان بالقدر، مسند احمد، ۲/۳۶۶) اس لیے کہ طاقت ور مومن انسانوں کی، سماج اور معاشرے کی خدمت کرے گا۔جو کم زور ہے اس سے اس کی توقع مشکل ہی سے کی جاتی ہے۔ایک موقعے پر آپ نے فرمایا کہ ''وہ مومن جو لوگوں سے ملتا جلتا اور ان کی تکلیفوں کو برداشت کرتا ہے وہ بہتر ہے اس مومن سے جو نہ کسی سے ملتا ہے اور نہ ان سے پہنچنے والی تکلیفیں برداشت کرتا ہے''۔(جامع ترمذی، ابواب

صفۃ القیامۃ، باب فی فضل المخالطۃ مع الصبر علی اذی الناس، مسند احمد، ۴۳/۲) قرآن کہتا ہے کہ یہ انسان کا حق ہے کہ وہ سوسائٹی کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرے۔ منافقوں سے کہا گیا کہ تمھاری سرگوشیاں تمھارے حق میں سودمند نہیں ہیں، اس لیے کہ یہ ایک طرح کی سازشیں ہیں۔ ہاں اگر تم لوگوں کی اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی بات کرو تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہوگا اور اللہ اجر عظیم سے نوازے گا۔ (النساء:۱۱۴)

دفاع کا حق

ایک اور چیز جس کا آج بڑا چرچا ہے وہ ہے دفاع۔ اس بات کو تو دنیا تسلیم کرتی ہے کہ ہر ایک کو دفاع کا حق ہے۔ کوئی شخص کسی کی جان لینا چاہے، کسی کی عزت و آبرو پر حملہ آور ہو یا کسی کا مال چھیننا چاہے، اس کی جائیداد پر قبضہ کرنا چاہے، اس کے گھر کو آگ لگانا اور اس کی بیوی بچوں پر حملہ کرنا چاہے، تو ظاہر ہے کہ وہ خاموش نہیں بیٹھے گا، اس کا دفاع کرے گا، لیکن اس میں بے احتیاطی دو پہلوؤں سے ہوتی ہے۔ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ دفاع کے نام پر آدمی ان باتوں کا خیال نہیں رکھتا جن کا خیال رکھنا چاہیے۔ اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ دہشت گردی اور تشدد کے نام پر آدمی کو دفاع کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اسلام میں دفاع کا بہت واضح تصور موجود ہے کہ دفاع کب ہونا چاہیے اور کیسے ہونا چاہیے، وہ کن حالات میں جائز ہے اور کس حد تک جائز ہے اور کہاں حدود سے تجاوز ہوتا ہے؟ یہ تمام چیزیں قرآن و حدیث میں موجود ہیں اور ہمارے علماء و فقہاء نے بھی بڑی تفصیل سے اس پر لکھا ہے۔ دفاع انسان کا بنیادی حق ہے، لیکن اگر دفاع کے نام پر ظلم ہو تو یہ غلط ہے۔ یہاں انفرادی دفاع کی بات ہے۔ ریاست اور ریاست کے درمیان جو مقابلہ ہوتا ہے اس کی یہاں بحث نہیں ہے۔

کم زوروں کے حقوق

کسی جمہوری آئین کی ایک لازمی خصوصیت یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس میں اقلیتوں

اور کم زور طبقات کے لیے تحفظ فراہم کیا جائے، انھیں دوسروں کے مساوی حقوق دیے جائیں، ان کی حق تلفی نہ ہونے پائے اور انھیں ظلم وزیادتی سے بچانے کی تدبیر کی جائے۔

اسلام کے آنے سے پہلے کم زوروں کے حقوق عرب ہی میں نہیں، دنیا میں کہیں بھی محفوظ نہیں تھے۔ ان کا بری طرح استحصال ہو رہا تھا اور ان پر ظلم وزیادتی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ اسلام نے شروع ہی سے ان کے حق میں آواز اٹھائی اور ان پر جو ظلم وزیادتی ہو رہی تھی اس پر سخت وعید سنائی اور دنیا و آخرت میں اس کے برے انجام سے خبردار کیا۔ اس نے خواتین کے، زیردستوں اور محکوموں کے، یتیموں، لاوارث بچوں، معذوروں، بوڑھوں اور ضعیفوں کے حقوق صرف بیان ہی نہیں کیے، بلکہ عملاً فراہم کیے اور معاشرہ کو ان کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کی ترغیب دی اور ہم دردی اور تعاون کا جذبہ پیدا کیا۔

مذہبی آزادی کا حق

حقوق انسانی کے علم بردار مذہبی آزادی کو بھی انسان کا ایک حق قرار دیتے ہیں۔ اسلام نے بہت واضح الفاظ میں اس کا اعلان کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام لوگوں کو اپنے دین کا پابند بنا دیتا کہ کوئی اس سے بغاوت نہ کرتا، لیکن اللہ نے مذہب کے معاملے میں اس کو آزادی دی ہے اور اس کی یہ آزادی باقی رہنی چاہیے۔ اسی میں اس کا امتحان ہے۔ حضور ﷺ کے قلب میں فطری طور پر یہ تمنا موج زن تھی کہ آپ کے مخاطبین میں سے ہر ایک کو راہ ہدایت مل جائے۔ آپ سے کہا گیا:

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (البقرۃ: ۲۷۲)

آپ کی ذمے داری نہیں ہے کہ لازماً انھیں راہِ راست پر لے آئیں، بلکہ یہ اللہ کا کام ہے وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

یہ اصول بھی بیان ہوا ہے کہ:

لاَ اِکْـرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (البقرۃ:۲۵۶) دین کے سلسلے میں کوئی جبر نہیں ہے، ہدایت اور ضلالت واضح ہو چکی ہے۔

یعنی اب یہ آدمی کا اختیار ہے کہ وہ جس راہ کو چاہے اختیار کرے۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَ مَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (الکہف:۲۹) جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔

قرآن مجید نے کہا کہ مذہب پر گفتگو بھی ہو سکتی ہے، لیکن یہ گفتگو تہذیب کے دائرے میں ہونی چاہیے۔ ہدایت ہے: وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (النحل:۱۲۵) یعنی مذہب پر گفتگو ہو تو سلیقے اور تہذیب سے ہو، اس کے لیے غلط اور ناشائستہ انداز نہ اختیار کیا جائے۔ ہمارے علما نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم، اسلامی ریاست میں علی الاعلان یہ کہتا ہے کہ میں قرآن کو اللہ کی کتاب نہیں مانتا، محمد ﷺ کو اللہ کا رسول نہیں تسلیم کرتا تو بھی اسلامی حکومت اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرے گی۔ ہاں اگر وہ بدزبانی پر اتر آئے تو اس کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ کی شان میں یا حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ یا کسی بھی پیغمبر کی شان میں گستاخی ایک قابل تعزیر جرم ہے، اس کے ارتکاب پر اسلامی ریاست قتل کی سزا تک دے سکتی ہے۔ اسی طرح کسی بھی مذہب کے بانی یا اس کی محترم شخصیات کی توہین و تحقیر اور اس کے متعلق بدکلامی، سزا کی مستحق ہوگی اور قانون کے مطابق اس پر سزا دی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ جو حقوق کسی فرد یا طبقہ کو لازماً ملنے چاہئیں اسلام وہ تمام حقوق فراہم کرتا اور انسان کے فطری تقاضوں کی بہتر انداز میں تکمیل کرتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ دنیا ہی کی کامیابی کا نہیں، آخرت کی فوز و فلاح کا بھی ضامن ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے دونوں جہاں کی کامیابی کے لیے کسی دستور اور کسی ضابطۂ حیات کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کی اردو مطبوعات

	کتاب	مصنف	صفحات	قیمت
۱	معرکۂ اسلام وجاہلیت	مولانا صدرالدین اصلاحی	۲۱۶	۲۵
۲	غیر مسلموں سے تعلقات اوران کے حقوق	مولانا سیّد جلال الدین عمری	۳۳۲	۱۰۰
۳	صحت ومرض اوراسلامی تعلیمات	مولانا سیّد جلال الدین عمری	۳۸۸	۱۷۵
۴	مسلمان عورت کے حقوق اوران پر اعتراضات کا جائزہ	مولانا سیّد جلال الدین عمری	۲۴۰	۸۰
۵	اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور	مولانا سیّد جلال الدین عمری	۱۷۶	۴۰
۶	اسلام اورمشکلاتِ حیات	مولانا سیّد جلال الدین عمری	۸۸	۸
۷	مذہب کا اسلامی تصور	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۵۹۱	۱۰۰
۸	مشترکہ خاندانی نظام اوراسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۰۲	۲۰
۹	وحدتِ ادیان کا نظریہ اوراسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۹۲	۴۰
۱۰	آزادیٔ فکرونظر اوراسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۲۸	۴۰
۱۱	قرآن، اہلِ کتاب اورمسلمان	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲۹۶	۷۰
۱۲	حضرت ابراہیم علیہ السلام	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲۰۰	۴۰
۱۳	ایمان وعمل کا قرآنی تصور	پروفیسر الطاف احمد اعظمی	۲۸۰	۲۵
۱۴	عہدِ نبوی کے غزوات وسرایا	ڈاکٹر روفہ اقبال	۲۴۷	۲۵
۱۵	عہدِ نبوی کا نظامِ حکومت	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۱۳۶	۳۰
۱۶	شیئر بازار میں سرمایہ کاری	ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی	۱۵۶	۴۵
۱۷	تصوّف- ایک تجزیاتی مطالعہ	پروفیسر عبیداللہ فراہی	۲۰۰	۲۵

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

تحقیق وتنقید

اندلس میں حدیث کا تعارف اور اولین محدث

جناب محمد احمد زبیری

دنیا کے ہر خطہ کے مسلمانوں نے ہر زمانے میں حدیث کی خدمت کی ہے، کیونکہ حدیث وہ ذریعہ اور وسیلہ ہے جو سنت تک رسائی کا سبب بنتا ہے۔ عالم اسلام کے مختلف خطوں میں ہر زمانے میں علماء نے حدیث کی خدمت سرانجام دینے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ عالم اسلام کے جن خطوں نے حدیث اور دیگر اسلامی علوم وفنون کی خدمت کی اور اس میدان میں بے انتہا پیش رفت کی ان میں اسلامی اندلس نمایاں مقام رکھتا ہے۔ یہاں علوم قرآن، علوم حدیث وفقہ، فلسفہ وکلام، تصوف واحسان، تاریخ وسیرت نگاری، طبیعیات وکیمیا، طب وجراحت، طبقات الارض وفلاحت، غرض یہ کہ ہر میدان میں بیش قیمت کارنامے سرانجام پائے اور زندگی کے تقریباً سارے ہی شعبوں میں بھرپور ترقی ہوئی۔ اس طرح ہر علم وفن میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کو علمی میدان میں ایک عظیم مقام حاصل ہوا۔ ان میں سرفہرست شاطبی، ابن عربی، ابن حزم، ابن جبیر، ابن بیطار، ابن طفیل، یحییٰ بن یحییٰ، بقی بن مخلد اور ابن عبدالبر ہیں۔

اندلس میں حدیث نبوی کا ورود مسعود تدوین حدیث کے زمانے ہی میں ہو گیا تھا اور اکثر کتابیں ان کے مؤلفین کی زندگیوں ہی میں یہاں پہنچ گئی تھیں۔ اندلس کی زرخیز زمین میں، علم وفضل کی سرپرستی نے اسے عروج پر پہنچا دیا۔ حدیث کے میدان میں اندلس کے محدثین نے جو خدمات سرانجام دیں انہیں کما حقہ اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ اندلس کے سینکڑوں محدثین نے اپنی عمریں خدمت حدیث میں کھپا دیں۔

مشرق سے جو لوگ اندلس جا کر آباد ہوئے ان کی تعداد کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ صحابہ کرامؓ میں سے کوئی صحابی اندلس گیا یا نہیں، کسی مؤرخ نے اس کا ذکر نہیں کیا، لیکن

صاحب نفح الطیب نے ایک صحابی منیذر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اندلس تشریف لائے تھے۔ علامہ مقری ابن الآبار کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''ابن الأبار (۶۲۵ھ) نے تکملہ میں لکھا ہے کہ اندلس آنے والوں میں منیذر بھی تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ صحابی رسولؐ تھے اور افریقہ آ بسے تھے''۔

عبد الملک بن حبیب (۲۳۸ھ) نے ابو محمد الرشاطی کے حوالے سے ان کی اندلس آمد کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کے علاوہ کسی اور نے اس کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ بعض حفاظ حدیث نے منیذر کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ منیذر یمانی ہیں اور حجاری (۵۴۹ھ)[۲] نے بھی انہیں صحابۂ کرام میں شمار کیا ہے۔ وہ موسیٰ بن نصیر کے ساتھ اندلس داخل ہوئے۔ ابن بشکوال (۵۷۸ھ) نے لکھا ہے کہ وہ نوعمر صحابہ میں سے تھے۔ ابن عبد البر نے اپنی کتاب الاستیعاب میں بھی انہیں صحابہ میں شمار کیا ہے اور انہیں منیذر افریقی لکھا ہے۔ ابن بشکوال کہتے ہیں کہ ابن عبد البر نے ان سے ایک حدیث روایت کی ہے جو انھوں نے رسول کریم ﷺ سے سنی تھی۔ ابو علی بن السکن نے اپنی کتاب 'الصحابہ' میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ان سے کئی ایک احادیث مروی ہیں۔ ابن نافع نے 'معجم الصحابہ' میں اور امام بخاری (۲۵۶ھ) نے اپنی کتاب 'تاریخ کبیر' میں ان کا ذکر کیا ہے۔ امام بخاری لکھتے ہیں کہ ابو المنیذر رسول اللہ ﷺ کے صحابی تھے اور افریقہ میں جا بسے تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث روایت کرتے ہیں۔

من قال رضیت باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد صلی اللہ علیہ وسلم نبیا فانا الزعیم لأخذن بیدہ فادخلہ الجنۃ[۳]	جس شخص نے کہا کہ میں اللہ کو اپنا رب مان کر راضی ہوا اور اسلام کو اپنا دین قرار دے کر اور محمد ﷺ کو اپنا نبی مان کر، تو اس شخص کے لیے میں ضامن ہوں۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر میں اس کو جنت میں لے جاؤں گا۔

تابعین میں سے جو اصحاب اندلس آئے، ان کی تفصیل بھی علامہ مقری نے نفح الطیب کے چھٹے باب میں لکھی ہے۔ ان تابعین میں سے ایک موسیٰ بن نصیر ہیں۔

حنش الصنعانی بھی ان تابعین میں سے ہیں جو اندلس آئے۔ ابن بشکوال کی کتاب میں ابن وضاح کے حوالے سے درج ہے کہ ان کا لقب حنش، نام حسین بن عبداللہ اور کنیت ابوعلی تھی اور انہیں ''ابورشدین'' بھی کہا جاتا تھا۔ ابن بشکوال کہتے ہیں کہ ان کا تعلق شام کے علاقے صنعاء سے تھا۔ ابن یونس[۴] نے اپنی تاریخ 'تاریخ اعیان مصرو افریقیہ والاندلس' میں ان کے بارے میں لکھا ہے: ''یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے اور انہوں نے رویفع بن ثابت (م۱۰۰ھ) کے ساتھ مراکش کے غزوات میں حصہ لیا اور اندلس کی جنگی مہموں میں موسیٰ بن نصیر کے ساتھ شریک تھے۔ افریقہ کے ٹیکس اور دیگر واجبات وصول کرنے کی ڈیوٹی پر مامور رہے۔ انتہائی عبادت گزار اور زاہد تھے۔ رات کے وقت چراغ جلا کر نوافل میں قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور ساتھ ہی ایک برتن میں پانی رکھ لیتے۔ جب ذرا نیند محسوس ہوتی چہرے پر چھینٹے مار لیتے۔ ۱۰۰ھ میں افریقہ ہی میں ان کا انتقال ہوا''۔[۵]

ابن عساکر نے بھی اپنی تاریخ میں ان کے تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ اس میں ہے کہ یہ صنعاء (شام کے دیہات میں سے ایک گاؤں) کی طرف منسوب ہیں۔ اس سے یمن کا دارالحکومت صنعاء مراد نہیں ہے۔ ان کے علاوہ ابوعبداللہ علی بن رباح اللخمی (۱۱۲ھ) بھی اندلس آئے۔ ابن یونس اپنی تاریخ مصر میں ان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''یہ عام یرموک (۱۵ھ) میں پیدا ہوئے۔ عبدالعزیز بن مروان کے ہاں خصوصی قدر و منزلت رکھتے تھے۔ ۱۱۲ھ میں افریقہ ہی میں ان کا انتقال ہوا''۔[۶]

ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن یزید المعافری الحبلی (۱۰۰ھ) بھی اندلس آئے۔ ابن بشکوال ان کے حالات میں لکھتے ہیں کہ یہ ابوایوب انصاریؓ اور عبداللہ بن عمروؓ سے روایت کرتے ہیں۔ امام بخاری نے اپنی تاریخ کبیر میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ اہل مصر میں سے تھے۔ ابن یونس اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ ان کا انتقال ۱۰۰ھ میں افریقہ میں ہوا۔ یہ بہت نیک اور صالح بزرگ تھے۔ اہل قرطبہ کے ہاں مشہور ہے کہ یہ قرطبہ میں فوت ہوئے اور وہیں دفن ہوئے۔ ان کی مرقد مرجع خلائق تھی۔ لوگ تبرک

کے لیے حاضری دیا کرتے تھے۔ ۷

حیان بن ابی جبلہ کے بارے میں ابن بشکوال نے لکھا ہے کہ یہ قریش کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ابوالنصران کی کنیت تھی۔ ابوایوب محمد بن تمیم اپنی کتاب 'تاریخ افریقہ' میں لکھتے ہیں: کہ مجھ سے فرات بن محمد نے بیان کیا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اہل افریقہ کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے دس تابعین کو بھیجا جن میں حیان بن ابی جبلہ بھی تھے۔ یہ عمرو بن العاص، عبداللہ بن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۲۲ھ میں افریقہ میں ہوا۔

ابن الفرضی (م۴۰۳ھ) لکھتے ہیں کہ موسیٰ بن نصیر کے ساتھ یہ اندلس پر حملہ آور ہوئے اور قرقشونہ کے قلعے تک پہنچ گئے۔ یہیں ان کا انتقال ہوا۔ مغیرہ بن ابی بردہ بھی ان تابعین میں سے ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھی اندلس آئے۔ یہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ امام مالک نے اپنی مؤطا میں ان سے احادیث روایت کی ہیں۔ امام بخاری نے بھی اپنی تاریخ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

حیاۃ بن رجا التمیمی کے بارے میں ابن حبیب (م۲۳۸ھ) نے لکھا ہے کہ یہ موسیٰ بن نصیر کے ساتھ اندلس آئے۔ علامہ مقری ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ میرے خیال میں یہ کہنا درست نہیں کہ حیاۃ بن رجا التمیمی اندلس آئے بلکہ یہ رجاء بن حیاۃ ہیں۔

عیاض بن عقبہ الفہری بھی ان تابعین میں سے ہیں جن کے بارے میں ابن حبیب نے لکھا ہے کہ وہ ان چار تابعین میں سے ہیں جنہوں نے اندلس کا محاصرہ کیا اور مالِ غنیمت میں کسی قسم کی خیانت نہیں کی۔

ان تابعین میں عبدالجبار بن ابی سلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف بھی ہیں جن کے دادا عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں۔ ان میں مغیرہ بن ابی بردہ نشیط بن کنانہ بھی ہیں جو حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ امام مالک نے اپنی مؤطا میں ان سے احادیث روایت کی ہیں۔ امام بخاری نے 'تاریخ' میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ موسیٰ بن نصیر انہیں مختلف فوجی مہموں پر روانہ کرتے تھے۔ ۸

ان تابعین میں عبداللہ بن شماسہ الفہری بھی ہیں۔ ابن بشکوال ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ مصری تھے۔ امام بخاری نے بھی اپنی تاریخ میں ان کا ذکر کیا ہے۔[۹]

حمیدی (م ۴۸۸ھ) نے اپنی تالیف جذوۃ المقتبس میں پانچ ایسے تابعین کا ذکر کیا ہے جو اندلس آئے۔ ان میں محمد بن اوس بن ثابت انصاری، حنش بن عبداللہ الصنعانی، عبدالرحمٰن بن عبداللہ الغافقی اور موسیٰ بن نصیر شامل ہیں جب کہ انہوں نے زید بن قاصد السلکی مصری کا اضافہ کیا ہے۔[۱۰]

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ دینی اور مذہبی رجحانات کی جو فصل فتح اندلس کے وقت موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد، ان کے ساتھ مجاہدین اسلام، محدثین کرام اور فقہائے عظام نے لگائی تھی وہ بعد میں نمو پاتی رہی، یہاں تک کہ اسلامی اندلس کے آئندہ ادوار میں وہ لہلہانے لگی۔ ہمارے مؤرخین اور مصنفین کے ہاں اس نکتہ کو عام طور پر درخور اعتناء نہیں سمجھا جاتا، مگر یہ حقیقت ہے کہ یہ ان ہی کی مساعی جمیلہ اور خلوص نیت کا کرشمہ تھا کہ وہاں دین کا بہت چرچا رہا۔ دینی علوم کا حصول مسلمانان اندلس کی ثقافتی سرگرمیوں کا اہم ترین حصہ بنا رہا اور اس ماحول نے آگے چل کر دینی علوم کے تمام شعبوں کی آبیاری اور نشوونما کے اسباب فراہم کیے۔ اگر صرف ابن الفرضی (م ۴۰۳ھ)، الحمیدی (م ۴۸۸ھ) اور ابن بشکوال (م ۵۷۸ھ) ہی کی کتابوں کو سامنے رکھا جائے تو اندلس کے ہزاروں مفسرین، محدثین، فقہاء اور قضاۃ کی فہرست بآسانی مرتب کی جاسکتی ہے۔

اندلس میں سب سے پہلے حدیثِ نبوی کو متعارف کروانے کی سعادت کسے حاصل ہوئی؟ اس ذیل میں اندلس کے مشہور تاریخ نویس ابن الفرضی لکھتے ہیں کہ وہ صعصعۃ بن سلام شامی (م ۱۹۲ھ) ہیں۔ ابن الفرضی لکھتے ہیں:

یکنی ابا عبد اللہ، یروی عن	ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے اور یہ امام
الاوزاعی وعن سعید بن عبدالعزیز	اوزاعی، سعید بن عبدالعزیز اور دیگر شامی
ونظر آئھما من الشامیین. وکانت	علماء سے روایت کرتے ہیں۔ عبدالرحمٰن
الفتیا دائرۃ علیہ بالاندلس	بن معاویہ کے دور حکومت اور ہشام بن

أيام الامير عبد الرحمن بن معاوية وصدراً من ايام هشام بن عبدالرحمن وولى الصلاة بقرطبة وفى ايامه غرست الشجر فى المسجد الجامع وهو مذهب الاوزاعى والشاميين ويكرهه مالك واصحابه.

عبدالرحمٰن کی حکومت کے ابتدائی دنوں میں مفتی اندلس کے منصب پر فائز تھے اور جامع قرطبہ کے امام تھے۔ ان کی امامت کے زمانے میں جامع قرطبہ میں شجر کاری کی گئی جو کہ امام اوزاعی کے مسلک میں جائز ہے۔ جب کہ امام مالک اوران کے اصحاب اس کومکروہ قرار دیتے ہیں۔

اسپین کی اسکالر ازابیلا فائرو، جنہوں نے اندلس میں حدیث اور محدثین کے حوالے سے کافی کام کیا ہے، وہ صعصعۃ بن سلام کے بارے میں لکھتی ہیں:

"In the case of Sa'sa'a b Salam, it is the Egyptian traditionist Ibn Yunus (d.347/958) that names him as the first who introduced hadith into al-Andalus, without any mention as to where he took this information from or whether his source was Andalusian or Oriental".11

جہاں تک صعصعۃ بن سلام کا معاملہ ہے، مصری راوی ابن یونس انہیں اندلس میں اولین محدث کے طور پر ذکر کرتے ہیں، لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ ان کی معلومات کا ذریعہ اندلسی ہے یا مشرقی۔

اولین محدث کے ذیل میں دوسرا نام معاویہ بن صالح (م ۱۵۸ھ) کا آتا ہے۔ معاویہ بن صالح بھی حمص (شام) کے رہنے والے تھے۔ اُن کی کنیت ابوعمرو یا ابوعبدالرحمٰن بیان کی جاتی ہے۔ معاویہ بن صالح کا معاملہ صعصعۃ بن سلام سے کافی مختلف ہے۔ یہ مشہور

محدث اور جلیل القدر محدثین کے شیخ تھے۔ ان کی روایات صحاح ستہ میں بخاری کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں مذکور ہیں اور یہ امام مسلم کی شرائط پر پورا اترتے ہیں۔

معاویہ بن صالح عبدالرحمٰن بن معاویہ سے پہلے اندلس آئے اور اشبیلیہ میں قیام کیا۔ عبدالرحمٰن بن معاویہ نے انہیں شام بھیجا تاکہ اُس کی بہن ام اصبغ کو اندلس لے آئیں۔ ام اصبغ نے اندلس آنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں بڑھاپے کی وجہ سے اتنا طویل سفر نہیں کر سکتی، اب میری موت کا وقت قریب ہے۔ اس سفر سے واپسی کے بعد عبدالرحمٰن بن معاویہ نے انہیں قاضی بنا دیا۔[۱۲]

معاویہ بن صالح، اسحاق بن عبداللہ، یحییٰ بن سعید انصاری، عبدالرحمٰن بن جبیر بن نفیر، مکحول شامی، ابن راہویہ، راشد بن سعد، عبداللہ بن ابی قیس، العلاء بن حارث، ربیعہ بن یزید، حبیب بن عبید سے روایت کرتے ہیں۔ ان سے روایت کرنے والوں میں ثوری، لیث بن سعد، ابن وہب، معن بن عیسیٰ، زید بن حباب، عبدالرحمٰن بن مہدی، حماد بن خالد الخیاط، بشر بن العمری، اسد بن موسیٰ اور لیث کے کاتب ابوصالح قابلِ ذکر ہیں۔[۱۳]

ابو طالب، احمد کے واسطے سے روایت کرتے ہیں کہ معاویہ بن صالح بہت پہلے حمص کو چھوڑ کر چلے گئے اور یہ ثقہ ہیں۔ جعفر طیالسی ابن معین کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ معاویہ ثقہ ہیں۔ ابن ابی خثیمہ اور الدوری دونوں اپنی تاریخ میں ابن معین کے واسطے سے بیان کرتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید کے معیار نقد پر معاویہ پورے نہیں اترتے۔[۱۴]

لیث بن عبدہ روایت کرتے ہیں کہ یحییٰ بن معین کہتے ہیں: ابن مہدی جب معاویہ بن صالح کی روایات بیان کرتے تو یحییٰ بن سعید انہیں قبول نہ کرتے اور کہتے یہ کیسی احادیث ہیں؟[۱۵]

علی بن المدینی یحییٰ بن سعید کے واسطے سے بیان کرتے ہیں کہ ہم ان کی روایات کو قبول نہیں کیا کرتے تھے۔[۱۶]

عبدالرحمٰن بن مہدی انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں۔

ابو صالح الفراء ابو اسحاق الفزاری سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اس پایے کے راوی نہیں کہ ان سے احادیث روایت کی جائیں۔ ۱۷

عجلی اور امام نسائی انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں۔ ابوزرعہ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ محدث ہیں۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ یہ اندلس میں قاضی تھے اور ثقہ اور کثیر الروایت تھے۔ ۱۸

محمد بن عبدالملک بن ایمن کہتے ہیں کہ عراق میں میں نے دیکھا کہ معاویہ بن صالح کی روایات کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

محمد بن عبدالملک بن ایمن اندلس کے رہنے والے تھے۔ طلب حدیث کے لیے انہوں نے بلاد مشرق خصوصاً عراق کا سفر کیا۔ ان کا علمی سفر ۲۱۸ھ سے ۲۳۰ھ پر محیط ہے۔ پھر جب انہیں معاویہ بن صالح کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوا تو اندلس جا کر ان کی کتابوں کی تلاش شروع کی، لیکن انہیں مایوس ہونا پڑا۔ جس کا سبب انہوں نے اپنے ہم مکتب یحییٰ بن معین سے بیان کیا تھا۔

الخشنی لکھتے ہیں:

''ابن ایمن کہتے ہیں: جب میں اندلس واپس آیا اور معاویہ بن صالح کی کتابوں کی تلاش شروع کی تو میرے ہاتھ مایوسی کے علاوہ کچھ نہ آیا، کیونکہ یہ علمی ذخیرہ اہل اندلس کی کم ہمتی کی وجہ سے ضائع ہو چکا تھا''۔ ۱۹

الخشنی، قضاۃ قرطبہ میں لکھتے ہیں: ''جب امیر عبدالرحمٰن نے معاویہ بن صالح کو شام بھیجا تو اس سفر کے دوران انہوں نے حج بھی کیا۔ معاویہ بن صالح نے مسجد حرام میں بہت سے شیوخ کے حلقے دیکھے جن میں وہ حدیث کی درس و تدریس میں مشغول تھے۔ ان شیوخ میں عبدالرحمٰن بن مہدی، یحییٰ بن سعید القطان اور ان کے پایے کے دیگر محدثین موجود تھے۔ معاویہ بن صالح نے دو رکعت نماز ادا کی، اس کے بعد ایک حلقے میں جا کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے بعض احادیث ابوزہرہ کے واسطے سے **حدیر بن کریب عن جبیر بن نفیر، عن ابی الدرداء عن رسول اللہ** کی سند سے بیان کیں۔ جب وہاں موجود لوگوں نے یہ احادیث سنیں تو کہا: اے شیخ! جھوٹ نہ بولو اور اللہ سے ڈرو، کیونکہ روئے زمین

پر اس سند سے احادیث بیان کرنے والا صرف ایک شخص ہے، جو اندلس میں مقیم ہے اور اسے معاویہ بن صالح کہا جاتا ہے۔ معاویہ بن صالح نے جواب دیا: وہ میں ہی ہوں۔ یہ سنتے ہی تمام حلقوں میں موجود لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے ان سے احادیث لکھنی شروع کر دیں۔

شاید اسی وجہ سے محمد بن وضاح کہتے ہیں:

''مجھ سے یحییٰ بن یحییٰ نے بیان کیا کہ اندلس میں جس شخص نے سب سے پہلے حدیث کو متعارف کروایا وہ معاویہ بن صالح حمصی ہیں''۔ ۲۰

ان کی وفات کے بارے میں ابوسعید بن یونس لکھتے ہیں:

''معاویہ مصر آئے پھر اندلس چلے گئے۔ جب عبدالرحمٰن بن معاویہ بن ہشام اندلس آیا اور اس ملک پر قابض ہو گیا تو اس نے معاویہ سے رابطہ کیا اور انہیں شام بھیجا، پھر اندلس میں انہیں قضا کا منصب دیا''۔

مذکورہ بالا محدثین مشرق سے اپنے دامن کو علم حدیث سے بھرے ہوئے اندلس پہنچے اور اس کی علمی سیرابی کا سبب بنے۔ اہل اندلس میں سے سب سے پہلے جو محدث بلادِ مشرق گئے اور علوم اسلامیہ اور علم حدیث سے آراستہ ہو کر واپس آئے وہ غازی بن قیس (م ۱۹۹ھ) تھے۔ وہ قرطبہ کے رہنے والے تھے۔ ان کی کنیت ابومحمد تھی۔ انھوں نے امیر عبدالرحمٰن بن معاویہ کے زمانے میں اندلس سے مشرق کا سفر کیا۔ وہاں براہِ راست امام مالک بن انس (۱۷۹ھ) سے الموطا سنی۔ ان کے علاوہ محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی ذئب، عبدالملک بن جریج اور امام اوزاعی سے حدیث حاصل کی۔ قرآن کریم کی تعلیم اہل مدینہ کے قاری نافع بن ابی نعیم سے حاصل کی، پھر اندلس آ کر قرآن وحدیث کی تعلیم عام کی۔ یہ امام مالک سے اُس زمانے میں ملے جب وہ الموطا کی تالیف میں مشغول تھے۔ انہیں الموطا زبانی یاد تھی۔ علم وحکمت کے موتیوں سے دامن بھر کے وہ اندلس آئے اور قرآن وحدیث کی درس وتدریس میں مشغول ہو گئے۔ ایک دن ایک شخص نے ان کا حافظہ جانچنے کے لیے الموطا کی احادیث ترتیب بدل کر پڑھنی شروع

کیں۔ غازی بن قیس نے اُس شخص کو روکا اور کہا: ''ایسا نہ کرو، تم لوگوں کے سامنے وہ بات ظاہر کرنا چاہتے ہو جو میں چھپانا چاہتا ہوں، یعنی میں نہیں چاہتا کہ لوگوں کو پتا چلے کہ مجھے الموطا زبانی یاد ہے''۔[۲۱]

وہ انتہا درجے کے متقی پرہیزگار اور عبادت گزار تھے۔ ان کے حوالے سے ابن الفرضی لکھتے ہیں:

''اللہ کی قسم جب سے میں بالغ ہوا ہوں میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور اگر حضرت عمر بن عبدالعزیز یہ بیان نہ کرتے تو میں بھی بیان نہ کرتا اور انہوں نے نہ فخر کے لیے یہ بیان کیا اور نہ ریاکاری کے لیے، بلکہ اس لیے بیان کیا تاکہ ان کی پیروی کی جائے''۔[۲۲]

احمد بن عبدالبر (۴۶۳ھ) کہتے ہیں:

''غازی بن قیس دانش مند، نکتہ رس اور کثرت سے احادیث بیان کرنے والے تھے، مسائل کا گہرا ادراک رکھتے تھے، علم قرآن کے امام تھے، رات کو تہجد میں قرآنِ مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے اور رات بھر کثرت سے نوافل پڑھتے تھے''۔[۲۳]

غازی بن قیس نے اہل اندلس کو سب سے پہلے موطا سے متعارف کروایا اور نافع کی قراءت کی ترویج بھی انہوں نے کی۔[۲۴]

ان کے زہد اور تقویٰ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں قاضی بننے کی پیش کش کی گئی، لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔[۲۵]

حواشی مراجع

(۱) ابن الابار، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ ابی بکر القضاعی (۵۹۴-۶۳۵ھ) اندلس کا سب سے بڑا تذکرہ نگار ہے۔ ابن ابار نے ابن بشکوال کی کتاب الصلۃ کا ذیل 'التکملة لكتاب الصلة' لکھا ہے۔ اس کی دوسری اہم تالیف 'الحلة السيراء' ہے جو امراء، خلفاء اور وزراء کا تذکرہ ہے۔ تراجم پر مشتمل اس کی ایک اور تالیف 'المعجم فی

اصحاب علی الصدفی ہے۔اس کی تالیفات کی تعداد پینتالیس کے لگ بھگ ہے۔(عمر رضا کحالہ،معجم المؤلفین،۱۰/۲۰۴)

(۲) حجاری،ابومحمد عبداللہ بن ابراہیم (۴۹۹-۵۴۹ھ) وادی الحجارہ میں پیدا ہوا۔الحجاری نے امراء کی شان میں مدحیہ قصائد لکھے۔اس نے تاریخ میں چھ جلدوں پر مشتمل 'المسهب فی غرائب المغرب' لکھی جس میں ۵۲۹ھ/۱۱۳۵ء تک کے علماء کے حالات زندگی مع نمونۂ کلام،تاریخی اور جغرافیائی معلومات مرتب کیں۔ابوسعید نے اسی کتاب کو آخری شکل دے کر 'المغرب فی حلی المغرب' کا نام دیا۔ المقری نے نفح الطیب کی تالیف میں اس کتاب سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔(عمر رضا کحالہ، معجم المؤلفین،۶/۲۰۴)

(۳) جامع الترمذی،کتاب الدعوات،۵/۵۲۰؛ مجمع الزوائد،کتاب الاذکار،۱۰/۱۵۶؛ مسند احمد ۴/۲۲۷،طبرانی نے اسے معجم کبیر میں روایت کیا ہے۔اسے ابوداؤد،نسائی اور حاکم نے بھی نقل کیا ہے۔ہیثمی کے مطابق حدیث کے راوی ثقہ ہیں۔

(۴) ابوالحسن علی بن عبدالرحمٰن بن احمد بن یونس بن عبدالاعلی الصدفی المصری ماہر فلکیات اور مورخ تھے۔دیگر کئی علوم پر دسترس رکھتے تھے۔ان کی مشہور تالیفات 'زیج'،'غایة الانتفاع فی معرفة الدوائر والسمت قبل الارتفاع'،'تاریخ اعیان مصر' اور 'العقود والسعود فی أوصاف العود' ہیں۔(عمر رضا کحالہ،معجم المولفین ۷/۱۱۷،۱۱۸)

(۵) المقری، نفح الطیب،۱/۳،دارصادر،بیروت،۱۹۶۸ء

(۶) ایضاً،ابن الفرضی،تاریخ علماء الاندلس،۱/۲۱۲،مطابع سجل العرب،القاہرہ،۱۹۶۶ء

(۷) المقری، نفح الطیب،۱/۵

(۸) ایضاً

(۹) الحمیدی،جذوة المقتبس،۱/۳۵،الدار المصریة للتالیف والترجمہ،۱۹۶۶ء

(۱۰) المقری،نفح الطیب،۱/۳

(11) Isabel Fierro, The Introduction of Hadith in

al-Andalus, Der Islam, Band 66, Berlin, 1989, p.71

(۱۲) الخشنی، قضاۃ قرطبہ، ص۱۵، الدار المصریۃ للتالیف والترجمہ، ۱۹۶۶ء

(۱۳) ابن حجر، تہذیب التہذیب، ۲۱۰/۱۰

(۱۴) ایضاً، کان یحییٰ بن سعید لایرضاہ

(۱۵) ایضاً، کان ابن مهدی إذا تحدث بحدیث معاویه بن صالح زبره یحییٰ بن سعید وقال ایش هذه الاحادیث.

(۱۶) ابن حجر، تہذیب التہذیب، ۲۱۰/۱۰.....قال علی بن المدینی عن یحییٰ بن سعید ماکنا ناخذ عنه۔

(۱۷) ایضاً، ماکان باهل ان یروی عنه

(۱۸) الخشنی، قضاۃ قرطبہ، ۱۶.....کان ثقة کثیر الحدیث

(۱۹) ایضاً، قال ابن ایمن فلما انصرفت إلی الاندلس طلبت امهاته، کتبه فوجدتها قدضاعت بسقوط همم أهلها.

(۲۰) ایضاً، حدثنی یحییٰ بن یحییٰ قال اول من دخل الاندلس بالحدیث معاویة بن صالح الحمصی .

(۲۱) قاضی عیاض، ترتیب المدارک وتقریب المسالک، ۱۱۴/۳

(۲۲) ابن الفرضی، تاریخ العلماء والرواۃ، ۳۴۵/۱.....واللہ ما کذبت کذبة منذ اغتسلت، ولو لا أن عمر بن عبد العزیز قاله ماقلته وما قاله عمر فخراً ولا ریاء ولا قاله إلا لیقتدی به .

(۲۳) قاضی عیاض، ترتیب المدارک، ۱۱۵/۳.....کان عاملا نبیلا یروی حدیثاً کثیراً، ویتفقه فی المسائل، رأسأفی علم القرآن، متهجداً بالقرآن، کثیر الصلاة باللیل.

(۲۴) ابن الفرضی، تاریخ العلماء والرواۃ، ۳۴۵/۱.....”وهو اول من ادخل موطا مالک وقراء ة نافع الاندلس“

(۲۵) ایضاً

عہدِ نبوی اور خلافتِ اسلامی میں وصیت کی روایت

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

وصیت کی سماجی روایت بہت قدیم ہے اور غالبًا تمام انسانی معاشروں میں چلی آرہی ہے۔ قرآن مجید نے اس سماجی اور دینی رواج کا سلسلہ کم از کم حضرت نوح علیہ السلام کی ذات گرامی سے جوڑا ہے۔ دوسرے انبیاء کرام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی وصیت کا بیان اور عام وصیتِ انبیاء کرام کے ضمن میں حضرات موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کی وصیتوں کا ذکر آیا ہے۔ انبیاء کرام کی عام وصیتوں کی نوعیت خالص دینی ہے۔ انہوں نے اپنے فرزندوں، جانشینوں اور پیروؤں کو دین خالص پر مضبوطی سے قائم رہنے کی وصیت کی تھی۔ یہ درحقیقت اسلام پر جینے مرنے اور اسی کے مطابق زندگی کرنے کی وصیت تھی۔ (بقرہ-۱۳۲؛ شوریٰ-۱۳)

دینِ اسلام پر قائم رہنے اور اللہ تعالی کی خالص عبادت کرنے کی وصیت صرف دینی اور مذہبی نظر آتی ہے، مگر اسلام اور عبادت کے وسیع تر مفہوم کو لیا جائے تو اس میں تمام میدانِ حیات بالواسطہ سہی شامل ہوجاتے ہیں؛ لیکن اگر صرف اسے عام معنی میں دین ہی کی حد تک محدود رکھا جائے تب بھی وصیت کی روایت کی قدامت ثابت ہوجاتی ہے۔ دوسرے مآخذ مثلاً حدیث، سیرت اور تاریخ وغیرہ سے وصیت کی سماجی ریت کی نہ صرف تصدیق وتائید ہوتی ہے؛ بلکہ وصیت کی مختلف جہات کا بھی پتا چلتا ہے۔ آئندہ صفحات میں عہد نبوی اور خلافت اسلامی میں اس روایت پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو ہوگی۔

دین حنفی میں وصیت

قرآن مجید کے واضح بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے

اپنے فرزندوں کو وصیت کی تھی۔ ان میں حضرات اسمٰعیل واسحاق علیہما السلام شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں فرزندان ابراہیمی نے بھی پدری روایت کو جاری رکھا۔ نسلِ اسحاقی میں حضرت یعقوب بن اسحاق علیہما السلام کی وصیتِ فرزندان کا واضح قرآنی ذکر اس کی تائید کرتا ہے۔ نسلِ اسماعیلی میں بھی روایت ابراہیمی جاری رہی، اگرچہ اس کا ذکر بہت واضح الفاظ میں کم از کم قرآن مجید میں نہیں ملتا۔ عربوں- جاہلی عربوں- میں روایتِ وصیت بہت مستحکم تھی۔ اس سے یہ بہرحال واضح ہوتا ہے کہ وصیت کی سماجی اور دینی روایت نسل ابراہیمی میں کبھی منقطع نہیں ہوئی تھی۔ عرب جاہلی کی تاریخ سے اس کے ثبوت فراہم کئے جاسکتے ہیں

۔

جاہلی تاریخ کے ایک قد آور شخص قصی بن کلاب کے بارے میں آتا ہے کہ ان کے خسر حلیل بن حُبشیہ بن سلول خزاعی نے اپنی دختر حبّیٰ کی شادی قصی سے کی تو دختر کے اکرام واعزاز میں قصی بن کلاب کے حق میں تولیتِ کعبہ (سدانۃ البیت) کی وصیت کردی تھی۔ دوسری روایات یہ بتاتی ہیں کہ حلیل نے اپنے فرزند المحترش کو اپنا وصی بنایا تھا اور مؤخر الذکر نے قصی کی طلب پر ان کو تولیت کعبہ کا منصب بخش دیا تھا۔ قصی بن کلاب کو وصی بتانے والی روایات اس کی توجیہ کرتی ہیں کہ محترش فرزند حلیل ضعیف دماغ تھا، لہٰذا فرزند کے بجائے داماد کو وصی بنایا گیا۔ لیکن قصی بن کلاب کی وصیت کی روایات یا بعض روایات ضعیف قرار دی گئی ہیں کہ کلمہ ''یقال'' (کہا جاتا ہے) سے بیان کی جاتی ہیں۔ عربوں میں داماد کو وصی بنانے کی روایت بھی نہیں تھی۔ [۱]

متأخر اور جدید سیرت نگاروں میں سے بیش تر نے قصّی کی وصیت اور تولیت کعبہ کی روایت تسلیم کی ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ خاندانِ رسالت کے شرف سے اتنے متأثر ومغلوب ہیں کہ تحقیق وتنقید کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے۔ مولانا مودودیؒ نے دونوں طرح کی روایات پیش کی ہیں اور قاضی سلیمان منصور پوری وغیرہ نے تولیت کی خرید کا قصہ بیان کیا ہے۔ بہرحال متعدد حضرات نے قصی کے وصی خسر ہونے کا ہی ذکر کیا ہے اور اسی کو امر واقعہ اور صحیح ترین روایت سمجھا ہے۔ مولانا

ادریس کاندھلویؒ نے قصی کی ایک وصیت کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے اپنے فرزندوں کو صحیح دین کے باب میں کی تھی۔ [۲]

اسی طرح قصی بن کلاب کی وصیت کا ذکر کیا جاتا ہے کہ مرتے وقت انہوں نے سارے مناصب اپنے فرزند اکبر عبدالدار کے حوالے کر دئے تھے اور دوسروں کو کچھ نہیں دیا تھا، جس کے نتیجے میں فرزندان عبد مناف نے جنگ کی تھی اور اپنا حق پایا تھا؛ لیکن مؤرخ ازرقی نے تاریخ مکہ میں اور بعض دوسرے قدیم مؤرخین نے لکھا ہے کہ قصی بن کلاب نے دونوں فرزندوں کے حق میں مناصب کے مساوی تقسیم کرنے کی وصیت کی تھی، جو ان کی نسلوں میں برابر منتقل ہوتے رہے۔ عام اہل سیر اول الذکر روایت کو قبول کرتے ہیں اور دوسری روایت کی طرف توجہ تک نہیں کرتے۔ وجہ وہی خاندان رسالت کی محبت وعقیدت ہے۔ [۳]

ہاشم بن عبد مناف کے بارے میں اسی طرح آتا ہے کہ انہوں نے اپنے فرزندوں کے نابالغ اور کمر عمر ہونے کے سبب اپنے بھائی مطلب بن عبد مناف کو اپنا وصی مقرر کیا تھا اور ان کے حوالے سب کی پرورش اور تربیت وغیرہ کا کام کیا تھا۔

ہاشمی خاندان میں سب سے مشہور وصیت عبد المطلب بن ہاشم کی ہے کہ وہ خاصی معنی خیز ہے۔ تقریباً تمام قدیم وجدید سیرت نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ عبد المطلب ہاشمی نے مرتے وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش اور تربیت کی وصیت اپنے فرزند ابوطالب کو کی تھی، محض اس بنا پر کہ وہ ''حضرت عبداللہ کے حقیقی اور عینی بھائی تھے''۔ جب کہ دوسری متعدد روایات بتاتی ہیں کی عبدالمطلب ہاشمی کے فرزند دوم زبیر بن عبدالمطلب ہاشمی اپنے باپ کے وصی تھے کہ اپنے بڑے بھائی حارث کے باپ کی زندگی میں مرنے کے سبب اولاد اکبر بن گئے تھے اور اس طرح جانشینِ پدر بنے۔ دوسری حقیقت بھی بالعموم نہیں بیان کی جاتی کہ زبیر بن عبد المطلب ہاشمی بھی حضرت عبد اللہ کے حقیقی اور عینی بھائی تھے۔ ان تمام سیرت نگاروں کا انحصار اور ماخذ ابن اسحاق کی روایت ہے؛ لیکن یہ ابن اسحاق/ ابن ہشام دونوں کے شرف کی بات ہے کہ وہ ابوطالب کے حق میں

وصیت پدری کی روایت کو ضعیف اور عام زعم وخیال کا درجہ دیتے ہیں۔ ایک اور حقیقت بھی دوسری روایات سے سامنے آتی ہے کہ عبد المطلب ہاشمی نے دونوں حقیقی چچاؤں- زبیر وابوطالب-کو تربیت وکفالت نبوی کی وصیت کی تھی۔ بہرحال مشہور عام روایت کی اسنادی حیثیت خاصی کم زور ہے۔[۴]

عہد نبوی کی وصیتیں

حضرت محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب ہاشمی ﷺ اپنے والدین ماجدین کے اکلوتے یتیم فرزند تھے، لہٰذا آپ کے اپنے مرحوم باپ کے وصی بننے میں کسی قسم کی اڑچن پیش آئی اور نہ روایات کا اختلاف ہی پیدا ہوسکا۔ یہ بھی تقدیر الٰہی کا فیصلہ اور حکیمانہ فیصلہ تھا کہ آپ کی کوئی نرینہ اولاد ہی نہ تھی کہ آپ کو وصیت کرنے اور اپنا وصی مقرر کرنے کی حاجت پیش آتی۔ چونکہ آپ سربراہ امت اور حاکم ریاست اسلامی بھی تھے، لہٰذا آپ کے وصی آپؐ کے اولین خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ہوئے اور آپ نے بحیثیت خاتم النبیین اپنی پوری امت کو اپنے اکابر صحابہ کے ذریعہ دین پر قائم رہنے اور کتاب وسنت کو مضبوطی سے تھامے رہنے کی نبوی وصیت کی۔ شیعی نقطۂ نظر کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنا وصی مقرر فرمایا تھا، کتاب وسنت اور روایاتِ سیرت وتاریخ سے غلط ثابت ہوتا ہے۔ محققینِ حدیث وسیرت اور منصف مزاج سیرت نگاروں نے یہی نقطۂ نظر اپنایا ہے۔[۵]

رسول اکرم ﷺ بحیثیت سربراہِ امتِ اسلامی اور بحیثیت خاتم النبین بہرحال وصی بنتے رہے۔ آپ کے متعدد صحابہ کرام نے آپ کو اپنا وصی مقرر کیا اور مختلف مقاصد سے آپ کو اپنا وصی بنایا۔

رسول اکرم ﷺ بحیثیت وصی

مکی دور حیات میں رسول اکرم ﷺ کے وصی بننے کی روایات نہیں ملتیں، یا صراحت سے ان کا ذکر نہیں آتا؛ لیکن یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ آپ اس دور میں بھی مختلف صحابۂ کرام اور اہل قرابت وقربت کے وصی مکرم بنے تھے۔ ان میں سے حضرت خدیجہ رضی

اللہ عنہا سرفہرست معلوم ہوتی ہیں۔ وہ آپ کی زوجہ اولین بھی تھیں اور تجارت کی شریک بھی۔ ۱۰ نبوی/ ۶۲۰ء میں ان کی وفات ہوئی تو ان کے وارث آپ ہی بنے تھے۔ اس کا بہرحال امکان ہے کہ وصی بھی بنے ہوں۔ دوسرے اہلِ قرابت میں رسول اکرم ﷺ کے بڑے حقیقی اور عینی چچا جناب زبیر بن عبدالمطلب ہاشمی کی وفات بعثت سے کچھ قبل ہوئی۔ ان کے کم سن بچوں/ بچیوں کے ولی رسول اکرم ﷺ ہی تھے، خاص طور سے بعثت کے بعد ان کے اسلام لانے کی صورت میں۔ اسی حیثیت سے رسول اکرم ﷺ نے ان بچوں اور بچیوں کی شادیاں کی تھیں۔ اس کا مفصل ذکر ہم نے کہیں اور کیا ہے۔

دوسرے مکی صحابہ کرام اور اہلِ قرابت وقربت نے مکی دور میں انتقال کیا تھا۔ ان میں سے متعدد مسلم بھی تھے۔ ان کے اپنے عزیز وقریب زیادہ تر غیر مسلم تھے، لہٰذا اس کا امکان قوی ہے کہ ان مسلموں نے آپ ﷺ کو وصی بنایا ہو۔

بوقت ہجرت مدینہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالبؓ کو قریش کے لوگوں کی وہ مالی امانتیں واپس کرنے کے بعد ہجرت کی ہدایت فرمائی تھی۔ بعض روایات میں اس کو رسول اکرم ﷺ کی وصیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔[۶]

مدنی دور حیات میں بحیثیت وصی

حیاتِ نبوی کے دوسرے دور میں رسول اکرم ﷺ کے وصی بنائے جانے کی روایات زیادہ کثرت سے ملتی ہیں۔ ان کا سلسلہ آغاز دورِ مدنی سے ہی ہوجاتا ہے اور غالباً رسول اکرم ﷺ کی وفات (۱۱ھ/ ۶۳۲ء) تک چلتا رہا۔ ان وصیتوں میں مختلف قسم کے معاملات وامور کا ذکر ملتا ہے اور وصی بنانے والے دونوں طبقات مسلمین-مہاجرین وانصار -سے تعلق رکھتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے اس سماجی حیثیت اور قانونی مرتبہ ومقام سے بھی اپنا عظیم اسوہ چھوڑا ہے۔

-خزرج/ بنوالنجار کے سب سے بڑے اور عظیم مسلم سردار حضرت اسعد بن زرارہؓ تھے جو نقیب النقباء بھی تھے۔ ہجرت مدینہ کے سال ہی میں ان کا انتقال ہوگیا اور انھوں نے

اپنے انتقال سے قبل رسول اکرم ﷺ کو اپنا وصی مقرر کیا تھا۔ روایات سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ ان کے تمام امور و معاملات میں وصی بنائے گئے تھے جن میں ان کے مال کی تقسیم و انتظام اور ان کی دختروں کی شادیاں وغیرہ شامل تھیں۔ ان کے علاوہ ان کے ورثہ کے دوسرے انتظامات کا بار بھی رسول اکرم ﷺ کے طاقتور کاندھوں پر تھا اور آپ نے بحسن وخوبی وصی ہونے کے تمام فرائض انجام دئے تھے۔[۷]

- مہاجرین میں سے حضرت عبداللہ بن جحشؓ بنو اسد/ سعد ہُذیم کے قبیلے سے تھے، مگر مکی بن گئے تھے۔ انہوں نے غزوۂ احد ۳ھ/ ۶۲۵ء میں جانے سے قبل اپنے نابالغ فرزند حضرت محمد بن عبداللہ بن جحشؓ کا وصی رسول اکرم ﷺ کو بنایا تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے غزوۂ خیبر کی فتح کے بعد ۷ھ/ ۶۲۹ء میں ان کے لئے خیبر میں ایک آراضی خریدی تھی اور مدینہ کے سوق الدقیق (آٹے کے بازار) میں ان کو مکان کا ایک قطاع عطا فرمایا تھا. حضرت محمد بن عبداللہ بن جحشؓ کی ولادت ہجرت سے پانچ سال قبل یعنی ۶۱۷ء کے قریب ہوئی تھی۔ اس حساب سے وہ غزوۂ احد میں آٹھ سال کے تھے اور غزوۂ خیبر میں مال کی خریداری کے وقت بارہ سال کے ہو چکے تھے۔ اس ضمن میں یہ بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحش اسدیؓ رسول اکرم ﷺ کی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب ہاشمی کے فرزند تھے اور حضرت ثُویبہؓ کی رضاعت کے سبب آپ کے رضاعی بھائی بھی تھے۔[۸]

- مشہور صحابی حضرت سہل بن سعد ساعدی خزرجیؓ کے والد ماجد حضرت سعد بن اسعد ساعدیؓ نے غزوۂ بدر کے لئے جاتے ہوئے روحاء نامی مقام پر وفات پائی اور اس سے قبل رسول اکرم ﷺ کے حق میں اپنے سامان، سواری کے علاوہ تین وسق جو کی وصیت کی جو رسول اکرم ﷺ نے قبول فرمالی؛ لیکن بعد میں ان کا مال ان کے وارثوں کے سپرد فرمادیا اور مال غنیمت سے ان کے لئے حصۂ غازی بھی مقرر فرما کر ان کے وارثوں کو عطا فرمایا۔ روایات کے مطابق مرحوم ساعدی رسول اکرم ﷺ کے تین گھوڑوں - اللزاز، اللحاف، الظرب - کے نگراں تھے اور ان کے چارے پانی کا نظم کرتے تھے۔[۹]

-مشہور صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص زہریؓ حجۃ الوداع کے موقعہ پر سخت بیمار پڑے تو رسول اکرم ﷺ کو دوران عیادت یہ وصیت کی کہ ان کا سارا مال ان کی اکلوتی دختر کو دے دیا جائے۔ان کی ایک اور وصیت کا ذکر احادیث میں بہت آتا ہے کہ پہلے انہوں نے سارا مال دوسروں کو دینے یعنی صدقہ کرنے کی وصیت کرنی چاہی تھی، لیکن رسول اکرم ﷺ نے صرف ایک تہائی مال صدقہ کرنے کی وصیت کی اجازت مرحمت فرمائی اور باقی مال اولاد کے لئے ترکہ میں چھوڑنے کی ہدایت کی اور یہی اسلامی قانون بن گیا کہ وقف یا غیر کے لئے صرف ایک تہائی مال کی وصیت ہی کی جاسکتی ہے۔ان روایات میں رسول اکرم ﷺ کو وصی بنانے کی صراحت نہیں ملتی ہے، تاہم اس سے مراد یہی ہے۔حضرت سعد بن ابی وقاص زہریؓ رشتہ سے رسول اکرم ﷺ کے ماموں بھی لگتے تھے کہ بنو زہرہ/قریش کے خاندان سے تھے جو رسول اکرم ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ بنت وہب کا خاندان تھا۔[۱۰]

-حضرت سعد کے کافر بھائی عتبہ بن ابی وقاص زہری نے حضرت سعد بن ابی وقاص زہریؓ کو مرتے وقت وصیت کی تھی کہ زمعہ کی باندی کا لڑکا ان کی اولاد ہے، لہٰذا اس کو ان سے لے لینا۔ فتح مکہ کے موقعہ پر حضرت سعد نے اس لڑکے پر بھتیجے ہونے کا دعویٰ کر کے اپنی تولیت میں لینا چاہا تو حضرت عبد بن زمعہؓ نے کہا کہ وہ میرے باپ کا لڑکا اور میرا بھائی ہے۔حضرت سعدؓ نے خدمت نبوی میں عرض کیا کہ میرے بھائی نے اس کے بارے میں وصیت کی تھی اور مجھ سے وعدہ لیا تھا۔رسول اکرم ﷺ نے متنازعہ لڑکے کے بارے میں فیصلہ فرمایا کہ وہ عبد بن زمعہؓ کے قبضہ وتولیت میں رہے گا، کیونکہ ان کے باپ کے بستر پیدا ہوا تھا، مگر ام المؤمنین حضرت سودہ بنت زمعہؓ کو اس سے پردہ کرنے کا حکم دیا تھا کہ وہ کافر عتبہ بن ابی وقاص کے مشابہ تھا۔[۱۱]

عہد نبوی کی دیگر وصیتیں

رسول اکرم ﷺ کی حیات بابرکات میں بہت سے صحابہ کرام کی وفات ہوئی اور ان میں سے متعدد نے اپنی وصایا چھوڑیں۔ان میں وہ وصایا بھی شامل ہیں جن میں رسول

اکرم ﷺ کے علاوہ دوسرے لوگوں کو وصی بنایا گیا تھا۔ان سے متعلق روایات کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

-حضرت ابوعقیلؓ نے عہد نبوی میں کسی وقت وفات پائی اوران کی بیوی حضرت ام عقیلؓ نے خدمت گرامی میں آکر عرض کیا کہ ان کے شوہر نے مرنے سے قبل اس اونٹ کو اللہ کی راہ میں دے دینے کی وصیت کی تھی،مگر وہ انتہائی لاغر ہے۔رسول اکرم ﷺ نے ان کو ہدایت کی کہ اے ام عقیل!عمرہ کرو،رمضان میں عمرہ حج کے برابر ہوتا ہے۔۱۲؎

-مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعون جمحیؓ کی وفات ہجرت مدینہ کے بعد ہی ہوگئی تھی۔بعض روایات کے مطابق انہوں نے اپنے بھائی حضرت قدامہ بن مظعون جمحیؓ کو اپنا وصی بنایا تھا۔اس کا تھوڑا ذکر بعد میں آتا ہے۔۱۳؎

- بنوسلیم کے ایک صحابی قدد بن عمار سُلمیؓ نے رسول اکرم ﷺ پر ایمان لانے کے بعد بیعت کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ وہ فتح مکہ کے موقعہ پر ایک ہزار کا لشکر لے کر آئیں گے،لیکن جب وہ نوسو سپاہ کے ساتھ روانہ ہوئے (سو سپاہی قبیلہ کی حفاظت کے لئے چھوڑ دئے تھے) تو راستہ میں موت نے آلیا اور انہوں نے اپنے تین لوگوں - حضرات عباس بن مِرداس سُلمی ،اخنس بن یزید سُلمی اور حیان بن حکم سُلمی -کو تین تین سو کے دستوں پر امیر مقرر کیا اوران کو لشکر اسلامی کی مدد کرنے کی وصیت کی۔بعد میں رسول اکرم ﷺ نے بقیہ سو سپاہیوں کو بھی طلب فرمالیا تھا اوران کو جہاد میں شرکت اور غنیمت کا ثواب عطا فرمایا تھا۔۱۴؎

- حدیث بخاری: ۲۷۸۰ اور دیگر احادیث وروایات کے مطابق بنوسہم/ قریش کے ایک تاجر (گم نام) حضرات تمیم داری اور عدی بن بداء کے ساتھ تجارت کے لئے شام گئے۔سہمی تاجر مسلم تھے اور بقیہ دونوں حضرات اس وقت غیر مسلم تھے۔بہر حال سہمی تاجر کی اس دیار غیر مسلم میں وفات ہوگئی تو انہوں نے ان دونوں غیر مسلم داریوں کو وصیت کی کہ ان کا مال/ترکہ ان کے اصلی وارثین کو پہونچادیں۔اس کا واقعہ کا فی طویل ہے اور سورہ مائدہ-۱۰۶ میں اسی کا ذکر وحوالہ ہے۔حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اور

دوسرے شارحین اور علماء نے اس کی تفصیلات فراہم کی ہیں اور اسی سے یہ اصول نکالا گیا ہے کہ غیر مسلم علاقے میں مسلم کی عدم موجودگی کی صورت میں غیر مسلموں کو وصی بنایا جاسکتا ہے۔ یہ عہد نبوی کا ایک اہم واقعہ ہے۔[۱۵]

خلافتِ اسلامی کی بعض وصایا

ایام جاہلی، دور نبوی اور دین حنفی کی روایات وصیت کا سلسلہ خلافت اسلامی کے زمانے میں بھی نظر آتا ہے۔ ان میں متعدد خلفاء کرام بلکہ تمام تر خلفاء اسلامی کی وصیتیں شامل ہیں جو انہوں نے اپنے جانشینوں کو کی تھیں۔ ان کے علاوہ خلفاء کرام نے دوسرے اصحاب کو وصیتیں فرمائی تھیں، تاکہ اسلام اور اسلامی خلافت کے معاملات صحیح رہیں۔ عام صحابۂ کرام کی مختلف وصیتوں کا ذکر بھی ملتا ہے جو انہوں نے مختلف لوگوں کو مختلف معاملات کے بارے میں کی تھیں۔ ان صحابۂ کرام میں سے بعض نے خلفائے وقت کو اپنا وصی مقرر کیا تھا اور ان کے ذریعہ اپنی وصایا کو روبعمل لانے کی سعی کی تھی۔ بیش تر حضرات نے اپنے کسی معتمد، صاحبِ خیر اور عزیز وقریب کو وصی بنایا تھا اور تمام امور ان کے سپرد کردئے تھے۔ کچھ حضرات بڑے معتمد اور مشہور وصی تھے کہ بیک وقت متعدد صحابہ کرام نے ان کو اپنے اہل ومال کا وصی مقرر کیا تھا۔ وصیت کی اقسام بھی خاصی متنوع نظر آتی ہیں۔ ان میں سے مرحومین کی بچیوں کی شادیوں کی وصیت اہم ترین سماجی رجحان اور معاشرتی قدر کو اجاگر کرتی ہیں، وقف اور مال کے لئے بھی مختلف وصایا ملتی ہیں، نماز جنازہ، تدفین کے بارے میں صحابۂ کرام کی وصایا ان کے سیاسی رجحان اور سماجی رویے کو بھی سامنے لاتی ہیں۔ آراضی، اسلحہ اور اموال کی وصایا میں بڑی گونا گونی نظر آتی ہے۔ ان کا تعلق اوقاف سے زیادہ ہے۔ بعض دلچسپ روایات یہ بتاتی ہیں کہ شاگردوں، عزیزوں اور دوسرے قریبی لوگوں نے اپنے بزرگوں کو وصیت کرنے کی درخواست کی تھی۔ ان تمام روایات وواقعات وصایا کو ان ہی مذکورہ بالا عناوین کے تحت بیان کرنے سے بحث کا یہ زاویہ زیادہ ابھرے گا۔ اس بحث میں خلفائے وقت کی اپنے جانشینوں کی نام زدگی وغیرہ

کے بارے میں وصیتوں کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے کہ وہ معلوم و معروف بھی ہے اور عام واقعۂ تاریخ بھی ہے۔

امامتِ نماز کی وصیت

رسول اکرم ﷺ کی مشہور حدیث اور آپ کے مرض الوفات کا مشہور واقعہ ہے کہ آپ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے لئے امامت نماز کی وصیت کی تھی۔ مشہور واقعہ ہونے کے سبب اس پر بحث کی ضرورت نہیں؛ لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر معمولی حالات میں ایسی وصیت کرنی بھی اسوۂ نبی کے مانند ہے اور حضرات صحابہ نے بسا اوقات اس پر عمل فرمایا تھا۔

-خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنی وفات کے وقت کسی ایک شخص کو خلیفہ یا جانشیں نامزد نہیں کیا تھا، بلکہ چھ اصحاب کرام پر مشتمل ایک جماعت مستحقین خلافت کی مقرر کر دی تھی اور وصیت کی تھی کہ ان ہی میں سے اگلے خلیفہ کا انتخاب کر لیا جائے اور ان کی وفات کے تین دنوں کے اندر اس انتخاب کو کر لینا ضروری ہے اور اس مدت میں حضرت صہیب رومیؓ کو نمازوں کی امامت کی وصیت کی تھی۔ امامتِ نماز پنجگانہ دراصل خلیفۂ اسلامی کا فرض منصبی بھی ہے۔[۱۶]

نمازِ جنازہ کی وصایا

خلیفۂ وقت یا امیر شہر کا ایک فرض منصبی اسلامی خلافت میں یہ بھی ہے کہ وہ نماز جنازہ کی امامت کرے، بشرطیکہ اس میں سہولت و آسانی ہو؛ لیکن بعض غیر معمولی حالات میں یا اپنی پسند و ناپسند کی بنا پر حضرات صحابہ کرام میں سے متعدد نے خاص اصحاب کرام کو اپنی نماز جنازہ پڑھانے کی وصیت کر دی تھی۔ بسا اوقات نماز جنازہ کے سلسلے میں امیرِ شہر اور وارثین میت کے درمیان اختلاف پیدا ہو جاتا تھا۔ اس طرح کے ناگوار حالات سے بچنے کی خاطر نماز جنازہ پڑھانے کی وصیت کر دی جاتی تھی۔

-خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطابؓ کی وفات کے وقت چونکہ ان کا جانشیں خلیفہ

نامزد نہیں ہوا تھا، لہٰذا حضرت عمرؓ نے حضرت صہیب بن سنان رومیؓ کو وصیت کی تھی کہ نماز پنجگانہ کے علاوہ ان کی نماز جنازہ بھی پڑھائیں۔ ۱۷

-حضرت عائذ بن عمرو مزنیؓ صالح صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ وہ بصرہ میں مکان بنا کر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ خلافت یزید بن معاویہ امویؒ کے دوران امارتِ عبیداللہ بن زیاد اموی کے زمانے میں ان کی وفات ہوئی۔ اس سے قبل انہوں نے وصیت کر دی تھی کہ حضرت ابو برزہ اسلمیؓ ان کی نماز جنازہ پڑھائیں، تاکہ امیر علاقہ عبیداللہ بن زیاد نہ پڑھا سکے:۔ ۱۸

- ان ہی صحابی مکرم یعنی حضرت ابو برزہ اسلمیؓ کو ایک دوسرے صحابی حضرت عبداللہ بن مغفل مزنیؓ نے اپنی نماز جنازہ پڑھانے کی وصیت کی تھی۔ اتفاق سے ان کی وفات بھی خلافت یزیدی کے زمانے میں ابن زیاد کی امارت عراق کے دوران ہوئی تھی اور مرحوم صحابی نے بھی بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ غالباً ان کی وصیت کی وجہ بھی یکساں تھی۔ ۱۹

-حضرت ارقم بن ابی الارقم عبد مناف مخزومیؓ سابقین اولین میں تھے اور عظیم ترین صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ ۵۳ھ میں خلافت معاویہؓ کے دوران ان کی وفات تراسی سال کی عمر میں مدینہ منورہ میں ہوئی۔ انہوں نے وصیت کی تھی کہ ان کی نماز جنازہ حضرت سعد بن ابی وقاص زہریؓ پڑھائیں جو اس وقت عقیق نامی مقام پر مدینہ سے ذرا دور سکونت پذیر تھے۔ جنازہ تیار ہو گیا اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو آنے میں تاخیر ہوئی تو حضرت مروان بن حکم امویؒ امیر شہر مدینہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھانی چاہی کہ ایک غائب شخص کی خاطر صحابی کا جنازہ نہیں روکا جا سکتا۔ اس پر ان کے فرزند حضرت عبیداللہ بن ارقم مخزومیؓ نے حضرت مروان کے نماز جنازہ پڑھانے سے اختلاف کیا اور تمام بنو مخزوم ان کا ساتھ دیا۔ اس پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اسی دوران میں حضرت سعد بن ابی وقاص زہریؓ تشریف لے آئے اور انہوں نے حسب وصیت نماز جنازہ پڑھائی۔ ۲۰

-حضرت حسن بن علی بن ابی طالب ہاشمیؓ نے مشہور روایات کے مطابق اپنے

برادر خورد حضرت حسینؓ کو اپنا وصی بنایا تھا، یا ان کو اپنی نماز جنازہ پڑھانے کی وصیت کی تھی۔ یہ واقعہ حضرت ارقم مخزومیؓ کی نماز جنازہ کے واقعہ سے قطعی مختلف ہے۔ بہر حال حضرت حسنؓ کا نماز جنازہ تیار ہو گیا تو حضرت حسینؓ نے امیر شہر حضرت سعید بن العاص امویؓ کو نماز جنازہ کی امامت کرنے کے لئے آگے بڑھا دیا اور فرمایا کہ اگر یہ سنت نہ ہوتی تو میں آپ کو امامت نہ کرنے دیتا۔[۲۱]

-حضرت ابوایوب انصاریؓ میزبان نبوی اور بزرگ ترین صحابی کی وفات غزوۂ روم کے دوران ہوئی جس کی بشارت رسول اکرم ﷺ نے دی تھی اور جس میں شرکت کرنے والے تمام لوگوں کی مغفرت کی بشارت بھی آپ ﷺ نے دی تھی۔ اسی بنا پر حضرت ابوایوب انصاریؓ سمیت بہت سے صحابہ وصحابیات نے اس لشکر اسلام میں شرکت کی جس کے سالار خلیفہ وقت حضرت معاویہ بن ابی سفیان امویؓ کے فرزند وولی عہد یزید بن معاویہ اموی تھے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے سالار لشکر کو اپنا وصی مقرر کیا تھا اور دوسری تمام وصایا کے علاوہ ان کی نماز جنازہ پڑھانے اور دشمن علاقہ کے آخری حصہ میں دفن کرنے کی وصیت کی تھی۔ حضرت معاویہ اموی کے جانشیں نے ان تمام وصایا پر عمل کیا اور اسلامی روایت کی ایک روشن مثال قائم کی۔[۲۲]

-مشہور صحابی حضرت خباب بن الارت تمیمیؓ نے کوفہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں ان کی وفات ہوئی۔ یہ سنہ ۳۷ھ یعنی خلافت علی بن ابی طالبؓ کا واقعہ ہے۔ حضرت خبابؓ نے وصیت کی تھی کہ ان کی تدفین ظاہر الکوفہ (کوفہ کا باہری حصہ) میں کی جائے، کیونکہ کوفہ میں یہ رواج پڑ گیا تھا کہ لوگ اپنی میتوں کو اپنے گھروں کے صحنوں (افنیتھم) اور اپنے احاطوں کے دروازوں پر دفن کیا کرتے تھے اور ان پر خیمہ لگا دیا کرتے تھے۔ حضرت خبابؓ نے یہ دیکھ کر وصیت کی کہ ان کو عام قبرستان میں، جو کہ کوفہ کے باہر تھا، دفن کیا جائے۔ حضرت علیؓ نے صفین سے واپسی پر ان کی سنت کی پیروی کو سراہا۔[۲۳]

شادیوں کی وصیت

کم سن لڑکیوں کے والدین کو اپنی بچیوں کی شادی کی فکر شروع سے ستانے لگتی ہے ۔ یہ ایک فطری بات ہے۔ نوجوان لڑکیوں کو چھوڑ کر مرنے والے باپ کو دوسرے خانگی امور کے علاوہ ان کی شادی کا خیال قبر تک ساتھ رہتا ہے ۔ اسی لئے وہ ہر زمانے میں اور ہر معاشرے میں اپنے وارثین، دوستوں اور عزیزوں کو ان کی بروقت شادی کرنے کی وصیت کر جاتے ہیں ۔ رسول اکرم ﷺ کو حضرت اسعد بن زرارہ خزرجیؓ نے دیگر امور کے علاوہ اپنی بچیوں کی شادی کی بھی وصیت کی تھی ۔ بعض دوسرے صحابۂ کرام کے ہاں بھی یہ روایت ملتی ہے۔ ان میں سے متعدد حضرات وخواتین کو بجا طور سے یہ فکر رہتی ہے کہ ان کی بچیوں اور بیواؤں کی کسی غلط جگہ شادی نہ ہو جائے ۔ لہٰذا عہد نبوی میں بھی اور اس سے زیادہ خلافت اسلامی کے زمانے میں متعدد صحابۂ کرام نے مناسب رشتے کرنے کی وصیت کی تھی اور بعض میں تو وصایا کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے اور بعض صحابیات اور دیگر خواتین کی شادی کی وصیتوں کا ایک زریں سلسلہ ملتا ہے۔

- حضرت امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہما رسول اکرم ﷺ کی چہیتی نواسی تھیں اور آپ کے بڑے داماد حضرت ابوالعاص بن ربیع عبشمیؓ کی دختر بلند اختر۔ حضرت فاطمہ بنت رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت علی بن ابی طالب ہاشمیؓ نے ایک روایت کے مطابق مرحومہ بیوی کی وصیت کے مطابق حضرت امامہ بنت ابی العاص عبشمیؓ سے شادی کر لی تھی ۔ حضرت امامہؓ کے والد ماجد حضرت ابوالعاص عبشمیؓ نے حضرت زبیر بن العوام اسدیؓ کو وصی بنایا تھا اور ان کو وصیت کی تھی کہ وہ ان کی دختر کی شادی کسی مناسب جگہ کر دیں اور حضرت زبیرؓ نے حضرت علی بن ابی طالبؓ کو مناسب ترین سمجھا ۔ جب حضرت علیؓ زخمی ہو گئے اور زندگی کی امید نہ رہی تو ان کو خوف ستانے لگا کہ ان کے بعد حضرت معاویہ بن ابی سفیان امویؓ ان (حضرت امامہؓ) سے شادی کر لیں گے، لہٰذا حضرت علیؓ نے حضرت مغیرہ بن نوفل بن حارث بن عبدالمطلب ہاشمیؓ سے وصیت کی کہ

ان کی بیوہ حضرت امامہؓ سے وہ خود شادی کرلیں اور حضرت مغیرہ بن نوفل ہاشمیؓ نے ان کی عدت ختم ہونے کے بعد ان سے شادی کرلی اور اس رشتہ سے ان کا فرزند یحیٰ نامی پیدا ہوا۔ حضرت مغیرہ بن نوفل ہاشمیؓ کے نکاح کے دوران ہی حضرت امامہ بنت ابی العاص عبشمی کا انتقال ہوا۔[۲۴]

صدقہ کی وصایا

متعدد صحابۂ کرام نے عہد نبوی میں بھی اور عہد خلافت راشدہ میں صدقہ/ مال کی وصیتیں اپنے اوصیاء کو کی تھیں۔ ان میں آراضی کے وقف شامل تھے، جیسے عہد نبوی میں حضرت عمرؓ نے ثمغ نامی آراضیِ خیبر فی سبیل اللہ وقف کی تھی، حضرت عثمان بن عفان امویؓ نے بئر رومہ خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کردیا تھا اور رسول اکرم ﷺ کی بشارت پائی تھی اور حضرت ابوطلحہ انصاریؓ نے اپنی سب سے قیمتی زمین اور پسندیدہ آراضی بیر روحاء کو اپنے اعزہ کے لئے وقف کردیا تھا اور ان سب کے لئے وصیتیں لکھ دی تھیں۔ ان میں شرائط وقف اور دوسری ضروری چیزیں بھی لکھ دی گئی تھیں۔ بعض صحابۂ کرام نے نقد رقوم صدقہ کرنے کی وصیت کی تھی اور دوسروں نے اپنے جانوروں کو صدقہ کرنے کی وصیت کردی تھی۔

-حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہریؓ عظیم ترین صحابہ میں بھی تھے اور مال دار ترین تاجرانِ مدینہ میں بھی۔ سنہ ۳۱ھ میں اپنی وفات کے وقت انہوں نے اللہ کی راہ میں پچاسی ہزار دینار صدقہ کرنے کی وصیت کی تھی۔[۲۵]

ان کی وصیتِ صدقہ کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے بدری صحابہ میں باقی ماندہ ہر صحابی کے لئے چار سو دینار کی وصیت کی۔ ان کی وفات کے وقت بدری صحابہ کی تعداد ایک سو تھی اور ان سب نے وہ رقم لے لی تھی اور وصیت کی رقم لینے والوں میں حضرت عثمان بن عفانؓ بھی شامل تھے جو بجائے خود ایک مال دار ترین صحابی اور اپنے وقت کے خلیفۂ اسلام تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن زہریؓ نے اللہ کی راہ میں ایک ہزار گھوڑے دینے

کی وصیت کی تھی، چنانچہ اس پر عمل کیا گیا۔

-حضرت حنظلہ بن حذیم بن حنیفہ المالکی تمیمی نے اپنے فرزند حضرت حذیم کو وصیت کی تھی اور سب سے پہلے اپنے زیر تربیت و پرورش یتیم کے لئے سو اونٹوں کی وصیت کی تھی، جو جاہلی اصطلاح میں المطیبہ کہلاتے تھے۔ یہ وصیت عہد نبوی کی ہے۔۲۶

مثالی اوصیاء

رسول اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ امت کے لئے نمونہ ہے۔ آپ بعض صحابہ کے وصی رہے۔ اسی طرح بعض صحابۂ کرام اپنے دوسرے اصحاب کے وصی بنے تھے اور ان میں سے بعض حضرات تو مثالی وصی تھے۔ ان کو مثالی وصی اس لئے کہا گیا کہ متعدد صحابۂ کرام نے ان کو اپنا وصی بنایا تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنے کثیر صحابہ کے وصی بنائے جانے کی وجوہ تھیں اور وہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھیں کہ وہ مثالی اور معتبر ترین تھے۔ ان میں سرفہرست بلکہ سرخیل اوصیاء حضرت زبیر بن عوام اسدی قریشیؓ تھے۔ کم از کم سات صحابۂ کرام نے ان کو یکے دیگرے اپنا وصی مقرر کیا تھا، یہ ہشام بن عروہؒ کی روایت ہے۔ انہوں نے ان میں سے صرف چار صحابۂ کرام کے نام لینے کے بعد وغیرھم کہہ دیا ہے۔ اس روایت کے مطابق وصیت کرنے والے یہ چار صحابہ تھے:۔

- حضرت عثمان بن عفان اموی ؓ م ۳۵ھ
- حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری ؓ م ۳۱ھ
- حضرت مقداد بن عمرو قضاعی ؓ م خلافت عثمان بہ عمر ستر سال
- حضرت عبداللہ بن مسعود ہذلی ؓ م ۳۲ھ

حضرت زبیر بن عوام ؓ کا حال یہ تھا کہ وہ ان صحابۂ کرام کی اولاد کی حفاظت و تربیت و پرورش کرتے تھے اور ان پر اپنا ذاتی مال خرچ کیا کرتے تھے، حالاں کہ ان میں متعدد کی اولادوں کے پاس ان کے باپ کے ترکہ میں کثیر دولت ملی تھی اور وہ بجائے خود مال دار تھے۔۲۷

– دوسرے مثالی وصی حسن اتفاق سے حضرت زبیر بن عوام اسدیؓ کے فرزند اکبر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ تھے۔ان کو بھی کئی صحابہ کرام نے اپنا وصی بنایا تھا۔ان میں سے بعض بہت اہم شخصیات تھیں جن کا سیاسی وسماجی مرتبہ تھا۔ان میں سے ایک حضرت عبداللہ بن عامر بن کریز عبشمیؓ تھے جو خلافت عثمانی اور خلافت علوی میں بصرہ کے والی/گورنر رہے تھے۔ وہ اموی خاندان سے تھے اور حضرت عثمانؓ کے حامی ہونے کے سبب عثمانی طبقہ سے تھے اور واقعۂ جمل میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ تھے۔ بعد میں وہ دمشق چلے گئے اور حضرت معاویہؓ کے زمانے میں پھر تین برس تک والیٔ بصرہ رہے۔حضرت معاویہؓ نے ان کی درخواست پر ان کو والیٔ بصرہ بنایا تھا، کیونکہ بصرہ میں بہت لوگوں کے پاس ان کے اموال تھے جو انہیں وصول کرنے تھے۔سنہ ۵۷ھ میں جب ان کی وفات ہوئی تو انہوں نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو وصی بنایا تھا اور کسی اموی کو وصی نہیں بنایا۔حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اموی مخالف تھے۔ انھوں نے حرمین میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا تھا۔۲۸

–حضرت عبداللہ بن زبیر اسدیؓ کو وصی بنانے والی دوسری شخصیت حضرت حمنن بن عوف زہریؓ تھے جو مشہور صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہریؓ کے بھائی تھے۔ان کو کافی طویل عمر ملی۔ساٹھ سال جاہلیت میں گذارے اور ساٹھ سال اسلام میں۔ایک سو بیس سال کی عمر میں وفات پائی تو حضرت ابن زبیرؓ کو اپنا وصی مقرر کیا۔وہ مکہ ہی میں تا عمر رہے۔۲۹

–ان کو وصی بنانے والے تیسرے صحابی ثانی الذکر سے زیادہ مشہور ہیں اور وہ ہیں حضرت حکیم بن حزام اسدیؓ۔ وہ ان کے ہم خاندان بھی تھے اور حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ کے بھتیجے اور مہتمم تجارت بھی تھے اور ان سب سے بڑھ کر وہ رسول اکرم ﷺ کے دوست تھے ۔انہوں نے بھی کافی طویل عمر پائی اور قریب قریب سو سال تک زندہ رہے۔انہوں نے حضرت ابن زبیرؓ کو اپنا وصی مقرر کیا تھا۔۳۰

خلفائے وقت کو وصی بنانا

بعض صحابۂ کرام نے اسوۂ نبوی کی اتباع میں اپنے زمانے کے خلفاء اسلام کو اپنا

وصی بنانا بہتر سمجھا تھا۔اس کی بعض مثالیں ملتی ہیں۔ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وصی بنانے والوں نے اپنی وصیت کے نفاذ کی صورت ان خلفاء کرام اور امیرانِ وقت کے انتظامی ہاتھوں میں دیکھی تھی۔ظاہر ہے کہ امرائے وقت بہ آسانی اور بہ حسن وخوبی وصایا کا حکیمانہ نفاذ کر سکتے تھے۔

-حضرت اسید بن حضیر اوسیؓ بڑے عظیم صحابی تھے۔شعبان ۲۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔انہوں نے خلیفۂ وقت حضرت عمر بن خطابؓ کو اپنا وصی مقرر کیا۔ان کی بقیع میں تدفین کے بعد حضرت عمرؓ نے ان کی وصیت دیکھی تو ان پر چار ہزار دینار کا قرض پایا۔ حضرت عمرؓ نے ان کے باغ نخیل کے پھل مسلسل چار سال تک چار ہزار دینار میں فروخت کر کے ان کے قرض کو اتار دیا۔[۳۱]

غالبًا ان ہی اسباب ووجوہ سے حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے غزوۂ روم کے اموی سالار لشکر یزید بن معاویہؓ کو وصی بنایا تھا کہ ان کے جنازے کی دشمن علاقے کے آخری سرے پر تدفین ان کی قوت نافذہ کی محتاج تھی۔دوسرے اوصیاء چاہتے تو ان کی مرضی واجازت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس کے علاوہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو اپنے سالار لشکر کی قیادت وصلاحیت اور ایمان داری پر بھروسہ تھا، ورنہ وہ تمام صحابۂ کرام اور تابعین عظام کو چھوڑ کر ان کو کیوں وصی بناتے۔[۳۲]

سب سے دلچسپ واقعہ وصیت حضرت ثابت بن قیس بن شماس خزرجیؓ کا ہے۔ وہ شاعر وخطیبِ قوم تھے۔۱۲ھ/۶۳۳ء کی جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔بہ وقت شہادت ان کے جسم تو انا پر ایک بہت ہی قیمتی اور نفیس زرہ تھی۔ان کے لاشے کے پاس سے ایک مسلمان مجاہد کا گذر ہوا تو انہوں نے وہ زرہ اتار لی اور اپنے گھر چلے گئے جو کافی مسافت پر تھا۔اس دوران ایک مسلمان مجاہد کے خواب میں حضرت ثابت بن قیس خزرجیؓ آئے اور ان کو وصیت کی کہ وہ میری زرہ اس مسلمان سے لے کر خلیفہ/ امیر لشکر کے پاس پہونچا دیں اور ان سے کہیں کہ مجھ پر اتنا اتنا قرض ہے، وہ زرہ بیچ کر اسے ادا کر دیں۔ حضرت ثابتؓ نے نہ صرف اپنی زرہ کی متعین صفات بتائیں، بلکہ اس کے مقام اور شخص

کے اتے پتے سے بھی آگاہ کیا۔خواب دیکھنے والے مسلم مجاہد نے جاگنے کے بعد امیر لشکر حضرت خالد بن ولیدؓ کو سارا ماجرا کہہ سنایا اور انہوں نے حضرت ثابتؓ کی زرہ بازیاب کرلی ۔مسلم مجاہد اسے لے کر خلیفۂ وقت حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہونچا اور سارا قصہ سنادیا۔حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کے خواب کی بنا پر حضرت ثابت خزرجیؓ کی وصیت کا نفاذ فرمادیا۔اس واقعہ کے سوا ہمارے علم میں کوئی اور وصیت نہیں ہے جس کا نفاذ موت کے بعد کی گئی وصیت کی صورت میں کیا گیا ہو۔اس کی روایت حضرت انس بن مالکؓ کے علاوہ حضرت کے فرزندوں محمد، یحیٰ، اور عبداللہ فرزندانِ ثابت نے کی ہے اور تینوں ائمہ سنن نے اس کی تخریج کی ہے۔۳۳

خلفاء کی وصایا صحابۂ کرام کو

وصایائے خلفاء وامراء کی ایک جہت یہ ہے کہ جس طرح صحابۂ کرام میں سے بعض نے خلفاء وقت کو اپنا وصی بنایا تھا اسی طرح بعض خلفائے اسلام اور امرائے وقت نے اپنے نجی معاملات وامور کا وصی دیگر صحابۂ کرام کو بنایا تھا جو ان کے عزیز قریب یا معتمد تھے اور جن کے جود وکرم، محبت والفت وشفقت اور انتظام پر ان کو بھروسہ تھا۔ظاہر ہے کہ دیگر اوصیاء خلفاء وامراء کے منصبی جانشینوں کے علاوہ اشخاص تھے۔جانشینوں کے سپرد صرف منصبی امور حکومت کئے جاتے تھے۔نجی معاملات کے لئے وہ خلفاء وامراء جانشیں کے علاوہ دوسرے اشخاص کو وصی بنا سکتے تھے اور بناتے تھے۔

- خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطابؓ نے روایات کے مطابق اپنے فرزند کے بجائے اپنی دختر ارجمند حضرت حفصہؓ کو اپنا وصی بنایا تھا۔اس کی خالص وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت حفصہؓ ام المؤمنین تھیں اور اس درجۂ عظمت وتوقیر پر ان کے فرزند فائز نہیں ہوسکتے تھے۔صنفی لحاظ سے بھی یہ بہت اہم تقرری ہے کہ ایک خاتون کو وصی مقرر کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کی وصیت کے مطابق حضرت حفصہؓ ان کے تمام اموال اور جائدادوں اور اوقاف کی بھی متولی/ وصی بن گئی تھیں۔ان میں دوسرے اموال کے علاوہ غابہ کا وقفِ

عمری بھی شامل تھا۔ اس روایت میں خیبر کے وقفِ ثمغ وغیرہ کا ذکر نہیں؛ لیکن شاید وہ اس کی بھی نگراں تھیں جس طرح حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد آپ کا مصحفِ خاص حضرت حفصہؓ کے قبضے میں آیا تھا۔ حضرت حفصہؓ نے اپنے والد ماجد کے تمام اموال واوقاف وغیرہ کا وصی اپنے بھائی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو بنایا تھا۔ روایت میں یہ وضاحت ہے کہ حضرت حفصہؓ نے ان تمام چیزوں کا ان کو وصی بنایا تھا جن کا وصی حضرت حفصہ کو حضرت عمرؓ نے بنایا تھا۔۳۴

امرائے وقت میں حضرت زیاد بن ابی سفیان امویؒ کا ذکر خاص آتا ہے کہ کوفہ میں اپنی وفات کے وقت انہوں نے تین اشخاص کو اپنا وصی مقرر کیا تھا۔ ان میں سے ایک حضرت منجاب بن راشد ضبیؓ تھے جو کوفہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور ان کے فرزند حضرت سہم بن منجاب ضبی کوفہ کے اشراف میں سے تھے اور راوی حدیث تھے۔۳۵

اولاد کو وصیتِ پدری

عام خیال ہے کہ اولاد کے حق میں وصیت کرنا لاحاصل ہے کہ وہ صاحبان میراث ہیں اور ان کے حصے مقرر ہیں، جیسا کہ کتاب اللہ کی سورہ نساء کی آیات کریمہ میں ان کا ذکر ملتا ہے، تاہم یہ خیال جزوی طور سے صحیح ہے۔ اولاد کے حصوں- اللہ تعالیٰ کے مقرر حصوں- میں رد وبدل کرنے سے متعلق وصیت بلاشبہ نہیں کی جاسکتی۔ لیکن ان حصوں کی تعیین اور دوسرے معاملات کے بارے میں بلاشبہ وصیت کی جاسکتی ہے اور واقعتاً کی بھی گئی ہے۔ متعدد صحابۂ کرام نے اپنی اولاد کو مختلف مالی واخلاقی معاملات میں وصیت کی تھی۔

-حضرت سعد بن عمارہ سعدی/ سعد بن بکرؓ نے حافظ ابن مندہ وابونعیم کے بقول اپنی وفات کے وقت اپنی اولاد کو جمع کیا اور ان کو وصیت کی ۳۶

-حضرت سعید بن العاص امویؓ نے ۵۹ھ میں وفات پائی۔ اس سے ذرا دیر قبل اپنے فرزندوں کو جمع کر کے ان سے پوچھا! تم میں سے کون میری وصیت قبول کرتا ہے؟۔ فرزند اکبر نے عرض کیا! میں، اے والد محترم! فرمایا ''میری وصیت میں قرض کا اتارنا شامل

ہے جو اسی ہزار دینار کی مالیت کا ہے۔ فرزند کے استفسار پر کہ اتنا قرض کیوں لیا، وضاحت کی کہ ایک شخص کریم کے لیے، جس کی ضرورت پوری کی، ایک ایسے شخص کے لیے کہ جب میرے پاس آیا تو اس کا خون حیا کے مارے اس کے چہرے پر جھلک رہا تھا اور میں نے اس کی حاجت سوال کرنے سے پہلے پوری کر دی۔

حضرت علقمہ بن علاثہ عامری کلابیؓ بنو ربیعہ بن عامر کے اشراف میں سے تھے اور اپنی قوم کے سردار تھے۔ ان میں حلم و کرم، عقل و فرزانگی اور جود و سخا کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی۔ وہ وفات نبوی کے بعد مرتد ہو گئے تھے؛ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان کے ساتھ کریمانہ سلوک کیا اور وہ پھر مسلمان ہو گئے اور ان کا اسلام خالص اور مقبول ہو گیا۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے ان کو حوران کا گورنر (عامل) مقرر کیا تھا اور اسی منصب پر اسی شہر میں ان کی وفات ہوئی۔ مشہور شاعر اور ہجو گو حضرت حطیہ ان کے کرم وجود سے متمتع ہوتے رہتے تھے۔ وہ حضرت علقمہ کے پاس جا رہے تھے کہ ملاقات سے پہلے ہی علقمہ نے وفات پائی۔ لیکن حضرت علقمہ نے حضرت حطیہ کے لئے اپنے کسی فرزند کی طرح وصیت کی۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ حضرت علقمہ کو رسول اکرم ﷺ نے کھانا کھلایا تھا ۔۳۸

۔ حضرت مالک بن ضمرہ ضمریؓ بعد میں کوفہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور وہیں وفات پائی۔ ان کی بھتیجی کے بیان کے مطابق انہوں نے اپنے ہتھیار مہاجرین بنی ضمرہ کو دینے کی وصیت کی تھی، بشرطیکہ ان کا استعمال ''اہل بیت نبوت'' کے خلاف نہ کیا جائے۔ ان کی وفات کا زمانہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کا ہے اور اس وصیت کی شرط کی وضاحت کرتا ہے، کیونکہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان اس سے قبل آویزش ہو چکی تھی اور مہاجرین و انصار دونوں خیموں میں بٹ گئے تھے۔ ممکن ہے کہ مہاجرین بنی ضمرہ نے حضرت معاویہؓ کا ساتھ دیا ہو۔ ۳۹

۔ حضرت زبیر بن عوام اسدیؓ نے جنگ جمل میں شرکت سے قبل اپنے فرزند اکبر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو اپنا وصی مقرر کر دیا تھا، جیسا کہ ابن اثیر وغیرہ کا

بیان ہے۔[۴۰]

اولاد میں فرزندوں کو وصی بنانا عرب روایت اور اسلامی معاشرہ دونوں کی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ تاریخ عرب جاہلی سے اس کی مثالیں ملنی شروع ہوتی ہیں اور تاریخ اسلامی کے تمام ادوار میں بھی تلاش کی جاسکتی ہیں۔ اوپر چند مثالیں صرف اس قسم وصیت کو اجاگر کرنے اور ان میں سے بعض اہم ترین جہات کو بتانے کے لئے پیش کی گئی ہیں۔ ورنہ سچ پوچھئے تو ان کی ضرورت ہی نہیں۔

حواشی ومراجع

۱ بلاذری، انساب الاشراف ۱/ ۴۹؛ ابن اسحاق/ ابن ہشام، ۱۱۸:... وخزاعة تزعم ان حليل بن حبشيه اوصىٰ بذلك قُصيا ...“

۲ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی ۱/۱۶۳: ”اس تعلق سے حلیل نے مرتے وقت وصیت کی کہ حرم کی خدمت قصی کو سپرد کی جائے“... سلیمان منصور پوری، رحمۃ العالمین، ۲/ ۶۱-۶۲ حاشیہ؛... تو قصی کے وقت میں خانہ کعبہ کی تولیت قریباً ۴۴۰ء میں ان کو عطا فرمائی۔ ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفی، ۱/ ۲۷: شراب سے پرہیز کرنے کی وصیت بحوالہ زینی دحلانؒ، مودودی، سیرت سرور عالم، ۲/ ۸۰

۳ بلاذری ۱/ ۵۳-۵۴؛ ابن ہشام ۱/ ۱۲۹-۱۳۰ ومابعد؛ شبلی ۱/ ۱۶۵ ومابعد؛ منصور پوری ۲/ ۶۲ ومابعد

۴ شبلی ۱/ ۱۷۶؛ کاندھلوی ۱/ ۸۷؛ مودودی ۲/ ۱۰۱: ”عبدالمطلب کی وفات کے بعد بعض روایات کی رو سے ان کی وصیت کے مطابق اور بعض دوسری روایات کے مطابق از خود ابوطالب نے حضورؐ کو اپنی کفالت میں لے لیا“۔ سید ابوالحسن علی ندوی، السیرۃ النبویہ، ۱۰۳: ”وكان عبد المطلب يوصيه به فكان اليه ومعه“؛ ودیگر کتب سیرت؛ ابن اسحاق/ ابن ہشام ۱/ ۱۷۹:.. وكان عبد المطلب - فيما يزعمون - يوصى به عمه ابا طالب ...“ مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو خاکسار کا مقالہ ”کفالت نبوی کی وصیت عبدالمطلبی“ تحقیقات اسلامی علی گڑھ، جنوری-مارچ ۲۰۰۳ء

؛ص۱۱-۲۸؛الفرقان لکھنؤ، جنوری۲۰۰۳ء،ص۲۲-۲۸

۵ بخاری ، کتاب الوصایا ، باب الوصایا الخ؛ حدیث : ۲۷۴۰ ، نیز ۴۴۶۰، ۵۰۲۲ نیز حدیث: ۲۷۴۱ واطراف ؛ ۴۴۵۹، فتح الباری ۵/ ۴۳۷-۴۴۵ ومابعد کے مطابق حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت علی کو وصی نہیں بنایا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ کی بحث میں دیگر احادیث ودلائل ہیں؛

۶ اسدالغابہ۴/ ۱۹:..'' وأمره أن يؤدی عنه امانته ووصايا من كان يوصی اليه وما كان يؤتمن عليه من مال ..''

۷ ابن اثیر،اسدالغابہ۵/ ۴۲۱، ۴۶۲، ۴۷۱:...'' اوصی ابوامامه بأمی وخالتی الی رسول الله ﷺ /كانت هی (زينب) واختاها فريعة واخریٰ فی حجر رسول الله ﷺ أوصی بهن ابوهن الی رسول الله ﷺ فكان يحليهن الرعاث من الذهب /... نیز اسدالغابہ۵/ ۱۴:

۸ اسدالغابہ۴/ ۳۲۳-۳۲۴

۹ اسدالغابہ۲/ ۲۶۸:'' ... واوصیٰ للنبی صلی الله عليه وسلم برحله وراحلته وثلاثة اوسق من شعير فقبلها ثم ردها علیٰ ورثته ''

۱۰ اسدالغابہ۲/ ۲۷۴؛ بخاری، کتاب الوصایا، باب الوصیۃ بالثلث، حدیث ؛۲۷۴۴؛ فتح الباری، ۵/ ۴۵۲-۴۵۵ نیز دیگر احادیثِ باب وکتاب؛۲۷۴۲ جس پر زیادہ بحث حافظ ابن حجر عسقلانی کی ہے، ۵/ ۴۵۵-۴۵۲؛

۱۱ بخاری، کتاب الوصایا، باب قول الموصی لوصیہ...الخ؛ حدیث: ۲۷۴۵ وغیرہ، فتح الباری ۵/ ۴۵۵ وغیرہ دوسرے ابواب، اسدالغابہ۳/ ۳۶۸، نیز ۵/ ۱۰، خاکہ نافع بن عتبہ زہریؓ

۱۲ اسدالغابہ۵/ ۶۰۴:... ان ابا عقيل مات وأوصیٰ بهذا الجمل فی سبيل الله وانه اعجف ...

۱۳ اسدالغابہ۴/ ۱۹۸؛ بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب مقدم النبی ﷺ؛ کتاب الشہادات، باب القرعۃ

۱۴ اسد الغابہ ۴/۲۰۰-۲۰۱

۱۵ بخاری، کتاب الوصایا، باب قول اللہ عز وجل: الخ؛ فتح الباری ۵/۵۰۰-۵۰۴:.. ان السهمی المذکور مرض فکتب وصیته بیده ثم دسها فی متاعه ثم أوصیٰ الیهما ..'' اس قسم کے کئی تبصرے اور روایاتِ وصیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسد الغابہ ۳/۳۹۰-۳۹۱

۱۶ اسد الغابہ ۳/۳۴۲:

۱۷ اسد الغابہ ۳/۳۴۲''... وصهیب کان قد وصی الیه عمر بالصلاة علیه ویصلی بالناس الی ان یقوم خلیفة ...''

۱۸ اسد الغابہ ۳/۹۸''... وأوصیٰ أن یصلی علیه ابو برزة الاسلمی لئلا یصلی علیه ابن زیاد ...''

۱۹ اسد الغابہ ۳/۲۶۴-۲۶۵:...'' وصلّیٰ علیه ابو برزة الاسلمی بوصیة منه بذلك ...''

۲۰ اسد الغابہ ۳/۶۰:...''وأوصی ان یصلی علیه سعد بن ابی وقاص وکان سعد بالعقیق، فقال مروان: یُحبس صاحب رسول الله صلی الله علیه وسلم لرجل غائب وأراد الصلاة فابی عبید الله بن الارقم ذلك علی مروان وقامت معه بنو مخزوم ...''

۲۱ اسد الغابہ ۱/۱۵:''...ووصی الی اخیه الحسین ولم یشهده احد من بنی امیة الاسعید بن العاص، کان امیرا علی المدینة، فقدّمه الحسین للصلاة علیه وقال: لولاانها السنة لما قدمتك ...''

۲۲ اسد الغابہ ۲/۸۲ ومابعد؛

۲۳ اسد الغابہ ۲/۱۰۰ اومابعد؛

۲۴ اسد الغابہ ۵/۴۰۰: روایت میں ہے کہ حضرت امامہ کی اولاد ہی نہیں ہوئی اور نسل نبوی صرف حضرت فاطمہؓ سے چلی؛ نیز اسد الغابہ ۴/۴۰۷-۴۰۸، خاکہ حضرت مغیرہ بن نوفل ہاشمی جو خلافت حضرت عثمانؓ میں قاضی رہے تھے اور صحابی تھے۔

۲۵ اسد الغابہ ۳/۳۱۷:...وأوصیٰ بخمسین الف دینار فی سبیل الله قاله عروة بن الزبیر''

۲۶ اسدالغابہ۲/ ۵۷-۵۸،اس کا نفاذ نہیں ہوسکا، کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے اسے پسند نہیں فرمایا تھا۔

۲۷ اسدالغابہ۲/ ۱۹۸-۱۹۹،۳/۲۶۰؛۴/۴۱۱)" وکان یحفظ علی اولادھم مالھم وینفق علیھم من مالہ "

۲۸ اسدالغابہ۳/۱۹۱-۱۹۲

۲۹ اسدالغابہ۲/۵۳

۳۰ اسدالغابہ۲/۴۱-۴۲:ان کی عمر پر سب سے زیادہ بحث ہے۔

۳۱ اسدالغابہ۱/۹۳،" فنظر عمر فی وصیتہ فوجد علیہ أربعۃ آلاف دینار فباع ثمر نخلۃ اربع سنین باربعۃآلاف وقضی دینہ ۔"

۳۲ اسدالغابہ۲/۸۲

۳۳ اسدالغابہ۲/۲۲۹-۲۳۰:..." ولا نعلم احدا اجیزت وصیتہ بعد موتہ سواء ...الخ "

۳۴ اسدالغابہ۵/ ۴۲۶

۳۵ اسدالغابہ۴/ ۴۱۶:" وھو أحد الثلاثۃ الذین أوصیٰ الیھم زیاد بن ابیہ حین مات بالکونۃ ..."الخ

۳۶ اسدالغابہ۲/ ۲۸۷-۸۸۲،" فلما حضرتہ الوفاۃ جمع بنیہ وأوصاھم "، وصیت کی صراحت نہیں ہے۔

۳۷ اسدالغابہ۲/۳۱۰-۳۱۱،..'' قال : یا بُنیّ ! فی کریم سددت خلتہ ، وفی رجل جاء نی ودمہ ینزوی فی وجھہ من الحیاء فبدأتہ بحاجتہ قبل ان یسألینھا ..."

۳۸ اسدالغابہ۴/۱۳

۳۹ اسدالغابہ۴/۲۸۲:... " أوصیٰ عمی مالك بن ضمرۃ بسلاحہ للمھاجرین من بنی ضمرۃ الا انہ لا یقاتل بہ اھل بیت النبوۃ "

۴۰ اسدالغابہ۲/ ۱۹۸-۱۹۹

بحث ونظر

مولانا شبلی کی سیرۃ النعمان
اوراس پر معارضات

ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی

مولانا شبلی نعمانیؒ دنیائے علم وادب کے آفتاب تھے۔ان کی ذات سے تحقیق وتنقید کے بہت سے گوشے روشن ہوئے۔ان کے علمی نہج پر کام کرنے والوں کی ایک وسیع جماعت وجود میں آ گئی اوراسے آگے بڑھایا۔ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے۔اس کے ساتھ ان کی تحقیقات پر تنقیدیں بھی ہوتی رہی ہیں۔ڈاکٹر محمود حسن صاحب نے،مولانا شبلی کی 'سیرۃ النعمان' پر جو تنقیدیں ہوئیں، ذیل کے مقالہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔اس میں حدیث، فقہ، روایت، درایت، اجتہاد، تقلید، ظن اور یقین جیسے بہت سے مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ ان مسائل پر ایک سے زیادہ نقطۂ نظر پہلے سے چلے آ رہے ہیں۔اس مضمون کو بھی ایک نقطۂ نظر کی حیثیت ہی سے دیکھنا چاہیے۔اس سلسلے میں ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ مولانا شبلی نعمانی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی یا کسی بھی صاحب علم کا نقطۂ نظر جاننے کے لیے اس کی کسی ایک تحریر کو سامنے رکھنا کافی ہے یا اس کے پورے علمی اور فکری رویہ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے؟ بہر حال ان مسائل پر سنجیدہ گفتگو ہو سکتی ہے۔اس کے لیے تحقیقات اسلامی کے صفحات حاضر ہیں۔ (جلال الدین)

شمس العلماء علامہ شبلی نعمانیؒ (م۱۹۱۴ء) کی شخصیت نابغۂ روزگار کی حیثیت رکھتی تھی۔آپ بہ یک وقت عالم، ادیب، شاعر، مؤرخ، محقق اور ماہر علم کلام تھے۔تاریخ اور تذکرہ نویسی کے ذریعہ آپ نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بازیافت کی کوشش کی، لیکن جس خصوصیت نے آپ کو میدان تاریخ وادب کا میر کارواں قرار دیا وہ اردو زبان میں آپ کا مغربی معیار تحقیق تھا جس میں ہر بات مصنف اور کتاب کے ساتھ بہ قید صفحات وغیرہ رقم

کی جاتی تھی۔ آپ کے اسفار بھی تحقیقی نوعیت کے ہوتے تھے جن کا مقصد علمی خزانوں تک رسائی اوران سے فیض کا حصول تھا۔

علامہ شبلیؒ کے علمی مقالات نیز ادبی اور علمی تصنیفات کا منہج تاریخی ہوا کرتا تھا۔ ناموران اسلام میں آپ کی پہلی تصنیف 'المامون' اور آخری 'سیرۃ النبیؐ' ہے۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

اسلام کی علمی فتوحات کو اجاگر کرنے کے لیے علامہ شبلی نعمانیؒ نے ہر موضوع پر خامہ فرمائی کی ہے۔ 'المامون' کے بعد آپ نے 'الفاروق' لکھنے کا آغاز کیا، لیکن بعض تعویقات کی وجہ سے اسے اس وقت نامکمل چھوڑ کر بقول خود فقہ کی طرف توجہ کی اور ۱۵ر دسمبر ۱۸۹۳ء کو 'سیرۃ النعمان' یا سوانح ومناقب امام ابوحنیفہ دنیا کے سامنے پیش کردی۔

'سیرۃ النعمان' اپنے موضوع پر ایک مکمل کتاب ہے۔ اس کتاب میں علامہ شبلیؒ نے حدیث واصول حدیث اور فقہ واصول فقہ دونوں سے بحث کی ہے۔ بقول خود اس تصنیف میں ان کا انداز بیان مؤرخانہ، محدثانہ اور مجتہدانہ رہا ہے۔ چونکہ علوم اسلامیہ میں اصحاب الحدیث اور اصحاب الرائے شروع سے ایک دوسرے کے مقابل رہے ہیں، اس لیے 'سیرۃ النعمان' کے مباحث نے ایک بار پھر مقابلہ آرائی کا ماحول پیدا کردیا۔ امام ابوحنیفہؒ کے فضائل ومناقب سے کسی کو انکار نہیں تھا، لیکن مدح ومنقبت میں مبالغہ آرائی اور حدیث وفقہ کے تقابل اور محدثین وفقہاء کو حکیم اور عطار سے تشبیہ دینا ایسا فعل تھا جس کی بہر حال تصویب نہیں کی جاسکتی تھی۔ ائمۂ حدیث اور فقہائے مجتہدین دونوں کا شمار اساطین دین میں ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی کی حیثیت کو مجروح کرنا دراصل دین کی بنیاد کو کمزور کرنا ہے۔

علامہ شبلیؒ کے بعض فقہی اختلافی رسائل سے پہلے سے فضا گرم تھی۔ یہ زمانہ مناظروں کی گرم بازاری کا تھا۔ 'سیرۃ النعمان' کے شائع ہوتے ہی علمائے اہل حدیث میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا اور اس کے جواب میں کئی کتابیں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں۔ ان میں

سے ایک کتاب 'حسن البیان فیمافی سیرۃ النعمان' ہے جو مولانا عبدالعزیز محمدی رحیم آبادی (م ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۲۰ء) کی تصنیف ہے، جس میں 'سیرۃ النعمان' کے ایک ایک قابل ملاحظہ جملہ بلکہ فقرہ کا جواب دیا گیا ہے۔ کتاب زبردست علمی قدر و قیمت کی حامل ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے اعتراضات کی روشنی میں 'سیرۃ النعمان' کے بعد کے اڈیشنوں میں کچھ اصلاحی ترمیمات کی گئی ہیں۔ مزید یہ کہ علامہ شبلی نے اس کے بعد اپنی تحقیقات کا رخ موڑ دیا اور مکمل طور سے غیر نزاعی تحقیق کا کام کرتے رہے۔ 'حسن البیان' کی زبان موجودہ زمانہ کے لسانی ذوق کی تکمیل نہیں کرتی، نیز اس کے مباحث اتنے ادق ہیں کہ اس سے صرف علماء ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

دوسری کتاب جو اس سلسلہ میں شائع ہوئی وہ 'الارشاد الیٰ سبیل الرشاد فی امر التقلید والا جتہاد' ہے جو مولانا حکیم حافظ ابو یحییٰ محمد شاہجہاں پوری (م ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۲۰ء) کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں نفس تقلید کا علمی محاسبہ کیا گیا ہے۔ چونکہ ہندوستان میں فقہ حنفی کا شیوع ہے، اس لیے اس میں احناف کے بعض مسائل فقہیہ پر احادیث کی روشنی میں تنقید کی گئی ہے۔ ضمناً 'سیرۃ النعمان' کے مباحث حدیثیہ وفقہیہ پر نقد کیا گیا۔ یہ کتاب تقلید کے موضوع پر ایک سنجیدہ اور علمی اضافہ ہے، جس میں مقلدین اور غیر مقلدین دونوں کے لیے قابل فکر مواد ہے۔ خاص طور سے اس کے حواشی کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ مرحوم چونکہ خاندانی غیر مقلد تھے اس لیے تقلید شخصی کے وجوب کو انہوں نے عقلی اور نقلی دونوں طرح سے چیلنج کیا ہے۔ تحقیقی معیار نگارش کے لحاظ سے اسے مسلمانوں کے ہر طبقہ کے علماء کو پڑھنے کا مشورہ دیا جاسکتا ہے۔

اس ذیل میں تیسری اہم ترین کتاب جو شائع ہوئی ہے وہ حضرت مولانا عبدالسلام مبارکپوریؒ (۱۲۸۹ھ تا ۱۳۴۲ھ) کی 'سیرۃ البخاری' ہے۔ 'سیرۃ النعمان' اردو زبان میں اکابرین امت کی سیرت کے عنوان پر ایک اہم اور ضروری اضافہ ہے، لیکن اس کے فضائل میں مزید اگر کوئی اور بات نہ کہی جاسکتی ہو تو بھی اس کے نامۂ اعمال کی تحسین کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اس کی وجہ سے اردو زبان میں امام المحدثین ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل

بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) کی حیات اور کارناموں کا مفصل تذکرہ 'سیرۃ البخاری' کے نام سے سامنے آیا۔ 'سیرۃ النعمان' میں علامہ شبلیؒ نے اپنے اصول تحقیق سے کام لیتے ہوئے پوری کتاب کو حوالوں سے مزین کیا ہے۔ علامہ مبارکپوریؒ نے بھی اپنی نارسائیوں کے باوجود کئی مؤقر کتب خانوں اور بالخصوص ذخیرۂ خدا بخش سے استفادہ کرتے ہوئے وہی علمی معیار برقرار رکھا ہے جو اس عظیم کتابِ سیرت کے شایانِ شان ہے۔ 'سیرۃ النعمان' میں علامہ شبلیؒ نے علمائے حدیث کا جن الفاظ میں ذکر کیا تھا ان سے محدثین اور تمام علوم حدیثیہ کی تخفیف ہوتی تھی، اس لیے مؤلف 'سیرۃ البخاری' نے علم حدیث کے تعلق سے اصول حدیث اور علمائے محدثین کی قرار واقعی خدمات اور خصوصاً امام بخاری، ان کے رواۃ اور شروط پر محققانہ اور مفصل گفتگو فرمائی ہے۔ اس ذیل میں آپ نے فقہ الحدیث اور فقہ الرائے پر بحث کرتے ہوئے دونوں کے طرز فقاہت کا موازنہ کیا ہے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے 'سیرۃ النعمان' میں امام ابوحنیفہؒ کے قبول روایت اور طریق اجتہاد پر 'حدیث' اور 'فقہ' کے عناوین کے تحت مفصل گفتگو کی ہے۔ علمائے حدیث نے اس پر جو معارضے کئے ہیں ان کی تفہیم کے لیے امام صاحب کے افکار عالیہ کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔ اختصار کے لیے اس سلسلے میں عاجز مقالہ نگار صرف 'حدیث' کے عنوان پر گفتگو کرے گا۔

روایت بالمعنی کی قبولیت کے لیے امام ابوحنیفہؒ نے دو اصول قائم فرمائے ہیں:
(۱) فقہ راوی (۲) درایت۔ فقہ راوی یہ ہے کہ رواۃ حدیث فقیہ ہوں یعنی الفاظ کے اثر اور مطالب کی تعبیر سے واقف ہوں۔ اس اصول کے تحت اگرچہ امام صاحب نے ثقہ غیر فقیہ رواۃ کی احادیث کو بھی قبول کیا ہے، لیکن ان کا درجہ اول الذکر کے مقابلے میں کم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ثقہ راویوں میں انہوں نے اپنے اصول درایت کو استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔ فقہ راوی کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص مدلول الفاظ کو نہیں سمجھتا اس کو روایت باللفظ ضروری ہے۔ البتہ جو شخص مطالب کا رمز شناس ہے اس کی نسبت اختلاف ہے۔ کثرت رائے یہ ہے کہ وہ الفاظ کا پابند نہیں، لیکن امام صاحب نے اس اجازت کو صحابہ اور تابعین تک محدود کر دیا ہے۔ ملا علی قاریؒ نے اس سے یہ مطلب نکالا

کہ امام صاحبؒ روایت بالمعنی کو جائز نہیں رکھتے تھے[۲]۔ روایت باللفظ کے لیے حدیث ابن مسعودؓ سے دلیل لائی گئی ہے: نضّر اللہ امرءاً سمع مناشیئا فبلغه کما سمع فربّ مبلَّغ اوعیٰ من سامع۔[۳]

علامہ شبلیؒ اصول حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کے کردار کا یوں تذکرہ کرتے ہیں:

(۱) امام ابوحنیفہؒ نے درایت کے اصول قائم کیے اور حدیث کی تحقیق وتنقید میں ان کو برتا۔

(۲) اصول روایت میں علماء کا بڑا کام ہے، لیکن افسوس ہے کہ اصول درایت کے ساتھ چنداں اعتناء نہیں کیا گیا۔

(۳) یہ شرف صرف امام ابوحنیفہؒ کو حاصل ہے کہ جب اس فن کا نام ونشان بھی نہیں تھا اس وقت ان کی نگاہ ان باریک نکتوں تک پہنچی۔

(۴) روایت کی صحت اور عدم صحت کا مدار ہمیشہ راویوں کے اعتبار پر نہیں ہوتا ..... یہ بھی دیکھا جائے گا کہ وہ اصول درایت کے مطابق ہیں یا نہیں۔[۴]

علامہ نعمانیؒ نے درایت کی مندرجہ ذیل تعریف فرمائی ہے:

''درایت کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو اس پر غور کیا جائے کہ وہ طبیعتِ انسانی کے اقتضاء، زمانہ کی خصوصیتوں اور منسوب الیہ کے حالات اور دیگر قرائن عقلی کے ساتھ کیا نسبت رکھتا ہے۔ اگر اس معیار پر پورا نہیں اترتا تو اس کی صحت بھی مشتبہ ہوگی''۔[۵]

علامہ شبلیؒ کے نزدیک امام ابوحنیفہؒ نے درایت کے اصول یوں مرتب فرمائے ہیں:

(۱) ''جو حدیث عقل کے قطعی خلاف ہو وہ اعتبار کے قابل نہیں''۔ امام صاحب نے جب یہ قاعدہ قرار دیا اور روایات میں برتا تو اس کی سخت مخالفت ہوئی۔

(۲) عمومی واقعات کی احادیث اگر آحاد ہوں تو روایت مشتبہ ہوگی۔

(۳) علامہ عبدالکریم شہرستانیؒ نے امام صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ

قیاس جلی کو اخبار آحاد پر ترجیح دیتے ہیں[۶]۔ لیکن علامہ شبلی کو اس بارے میں امام صاحب کا واضح قول نہیں مل سکا۔ ان کے خیال میں اس قول کا انتساب امام صاحب کی طرف استنباطی ہے۔[۷]

(۴) احناف کی اصول فقہ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ: ''وہ حدیث جس کے رواۃ فقیہ نہ ہوں اور وہ ہر طرح قیاس کے مخالف ہو قابلِ حجت نہیں''۔ لیکن علامہ شبلی کے نزدیک یہ حنفیوں کا اصول نہیں ہے، بلکہ عیسیٰ بن ابان اور ان کے پیروؤں کی رائے ہے۔ ابو الحسن کرخی وغیرہ صریحاً اس کے مخالف ہیں۔ چنانچہ 'بیع مصراۃ' کی حدیث کو امام صاحب نے قیاس کی بنا پر رد نہیں کیا، بلکہ اس کے نسخ کا دعویٰ کیا ہے۔

(۵) امام صاحب حدیث صحیح کے مقابلہ میں قیاس کا مطلق اعتبار نہیں کرتے تھے، البتہ اثبات حدیث میں امام صاحب کی شرائط ہیں۔[۸]

(۶) امام ابوحنیفہؒ نے قیاس فقہی کو حدیث پر ہرگز مقدم نہیں رکھا۔

امام صاحب راویوں کے فہم و درایت پر کلام کرتے تھے، کیونکہ احکام شرعیہ مصالح پر مبنی ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کی 'حجۃ اللہ البالغۃ' میں اسی پر گفتگو ہے۔ لیکن لوگوں نے اس فعل کو لفظ 'قیاس' سے شہرت دی۔

(۷) یکساں پایہ کی دو متعارض احادیث میں امام صاحب موافق عقل کو تسلیم کرتے تھے۔ امام صاحب کی زبان میں یہ علت خفیہ ہے۔[۹]

محدثین بھی معلل احادیث سے استدلال کو تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ معلل کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ صرف ذوقی ہے جس کے لیے امام بخاریؒ کے استاد علی بن مدینیؒ نے ابہام کا دعویٰ کیا ہے۔ حالانکہ ایسی احادیث میں بعض مدرج، بعض باطل، بعض منکر اور بعض صحیح بتائی جاتی ہیں۔

علامہ شبلیؒ کے بقول ''بلا شبہ فن روایت کی ممارست سے ایک ملکہ یا ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس سے خود تمیز ہو جاتی ہے کہ یہ قول رسول اللہ ﷺ کا ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح شریعت کے احکام و مسائل اور ان کے اسرار و مصالح کے تتبع اور استقراء سے

ایسا ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس سے تمیز ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا ہوگا یا نہیں۔ لیکن ان اسرار و مصالح کا تتبع محدث کا فرض نہیں ہے، وہ مجتہد کے ساتھ مخصوص ہے۔[۱۰]

علامہ شبلی کے نزدیک اثبات احکام میں مراتب احادیث کے تفاوت سے چنداں اثر نہیں پڑتا۔ صحیح، حسن، ضعیف، مشہور، عزیز، غریب وغیرہ، ان میں سے صرف ضعیف احادیث کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ بقیہ سب محدثین کے نزدیک یکساں حجت ہیں۔ انہیں اس سے زیادہ تدقیق کی ضرورت نہیں تھی، اس لیے کہ فقہ ان کا موضوع نہیں تھا۔

(۸) امام ابوحنیفہؒ فقہ کے بانی ہیں، اس لیے ان کے نزدیک احادیث کے فقط تین درجے ہیں:

۱۔متواتر ۲۔مشہور ۳۔آحاد

متواتر سے فرضیت اور رکنیت ثابت ہو سکتی ہے۔ مشہور سے تقیید مطلق اور زیادۃ علی الکتب (یعنی اطلاق مقید۔ مقالہ نگار) ہو سکتا ہے۔ چونکہ آحاد ظنی ہونے کی بنا پر قرآن کے احکام منصوصہ پر اثر انداز نہیں ہو سکتے اس لیے اخبار آحاد سے زیادۃ علی القرآن پر بحثیں ہیں۔ (یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ مقالہ نگار)[۱۱]

(۹) اخبار آحاد ظنی ہیں۔ محققین اور اکثر ائمہ کا یہی مذہب ہے۔ لیکن ایک فرقہ اس کے خلاف ہے جس کے سرخیل حافظ ابن الصلاحؒ ہیں۔

علامہ شبلیؒ کے نزدیک ابن الصلاح کا قول اگرچہ ظاہر بینوں میں اور بالخصوص آج کل زیادہ رواج پا گیا، لیکن کچھ شبہ نہیں کہ وہ بالکل غلط اور بے دلیل خیال ہے۔ خود ائمۂ حدیث اس کے خلاف ہیں۔[۱۲]

علامہ شبلیؒ کے نزدیک تحقیق و تنقید کے لیے محدثین نے جو اصول مقرر کیے ہیں اور جن پر احادیث کی صحت کا مدار ہے، سب عقلی اور اجتہادی ہیں۔[۱۳]

حدیث اور اصول حدیث کے عنوان سے مولانا شبلی نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے یہ اس کا خلاصہ ہے۔ اس پر ایک نظر ڈالنے سے جو چند باتیں سامنے آتی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

(۱) احادیث متواترہ واجب القبول ہیں۔

(۲) اخبار آحاد ظنی ہیں، اس لیے اس ظن کا رفع ضروی ہے۔

(۳) ظن سے ہٹ کر بھی خبر کو درایت کے معیار پر پرکھا جائے گا۔ علامہ شبلیؒ نے درایت کی بھی اپنی تعریف فرمائی ہے اور اس کی شرائط مقرر کی ہیں۔

(۴) درایت کے علاوہ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ راوی فقیہ ہے یا نہیں۔ اگر راوی فقیہ نہیں ہے تو بعض معارضات کی موجودگی میں حدیث پر قیاس کو ترجیح دی جائے گی۔

علامہ شبلیؒ کا طرز استدلال علمائے دیوبند کے حلقہ میں بہ استثنائے چند (جیسے مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، مولانا عبدالرؤف داناپوریؒ) بہت پسند کیا گیا، کیونکہ اس سے حدیث پر فقہ کی برتری ثابت ہوتی تھی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا مضمون 'مسلک اعتدال' (مشمولہ 'تفہیمات۔ حصہ اول') سے بھی فی الجملہ اس کی تائید ہوتی ہے۔ انہوں نے بھی حدیث کو ظنی اور محدثین کو اخباری کہا اور فقہاء کی تعریف فرمائی ہے۔ اس طرز استدلال نے ایک طبقہ کو خواہ کتنا ہی خوش کیا ہو، لیکن اس سے منکرین حدیث کے طائفہ کی کافی حوصلہ افزائی ہوئی اور انہوں نے احادیث کی ظنیت اور نقد حدیث میں محدثین کی کم زوری کو بنیاد بنا کر پورے ذخیرۂ حدیث کا انکار کر دیا۔

مذکورہ چار نکات میں سے اول الذکر غیر نزاعی اور سب ہی کے نزدیک واجب التسلیم ہے، جب کہ باقی تین نکات اہل علم کے درمیان ہمیشہ معرض گفتگو رہے ہیں۔ لیکن ان نکاتِ سہ گانہ پر علامہ شبلیؒ نے جس انداز سے گفتگو فرمائی ہے اس نے ان کے اندازِ فکر کو تمام علمائے سابقین کے مقابلہ میں منفرد کر دیا ہے۔ پھر علمائے اہل حدیث اس سے کیوں نہ اختلاف کرتے، جب کہ ان کے نزدیک بہ شرط صحت اخبار آحاد سے عقائد کا اثبات بھی ہوتا ہے۔[۱۴]

صاحب 'حسن البیان' نے 'سیرۃ النعمان' کے جواب میں فن حدیث سے متعلق چند اہم مباحث پر جو گفتگو فرمائی ہے وہ اس طرح ہے:

فقہ الحدیث اور فقہ الرائے کا فرق۔ امام ابوحنیفہؒ کے قلیل الحدیث ہونے کی بحث (جو علامہ شبلی کو بھی تسلیم ہے)۔ محدثین کا طریق تفقہ واستنباط۔ امام بخاری کا ملکۂ فقاہت واجتہاد۔ ذکر صحیحین۔ اصول درایت اور اس کے معنٰی کی بحث۔ اصول فقہ کے بانی امام شافعیؒ تھے نہ کہ امام ابوحنیفہؒ۔ حدیث پر تقدیم قیاس کی مثالیں۔ خبر واحد سے زیادۃ علی الکتاب کی بحث۔ صحیحین کی احادیث کی قطعیت۔ فقہائے حنفیہ کا بے سند روایتیں بیان کرنا۔ صحیحین میں ایک حدیث کی متعدد اسناد کی بحث۔ حدیث وفقہ کے موازنہ میں علامہ شبلیؒ کی غلطی۔ حدیث وفقہ میں فرق۔ امام صاحب کی مقبول معنعن روایتیں۔ فن رجال پر علامہ شبلیؒ کے اعتراض کا جواب۔ جرح وتعدیل میں اختلاف کی کیفیت۔ حدیث مشہور ومتواتر کے ذکر کرنے میں مولانا شبلی نعمانی کی غلطی۔ فاطمہ بنت قیس کی روایت پر بحث۔ کچھ اختلافی مسائل۔

چونکہ اس مقالہ میں علامہ شبلیؒ کے صرف نظریاتِ حدیث پر گفتگو مطلوب ہے اس لیے صاحب 'حسن البیان' کی تمام فقہی تعقیبات سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف چند اہم مباحث کا ذکر کیا جاتا ہے:

خروج النساء فی العیدین۔ نفاذ طلاق۔ تعیین جزیہ۔ قراءت فاتحہ خلف الامام۔ اور نبیذ تمر سے وضو وغیرہ۔

جیسا کہ عرض کیا گیا 'الارشاد الیٰ سبیل الرشاد' حضرت مولانا ابو یحییٰ محمد خاں شاہ جہانپوریؒ کی تصنیف ہے جس میں نفس تقلید، اس کے وجوب، اس کے شیوع اور تاریخ پر ناقدانہ گفتگو کی گئی ہے۔ مقالہ کے عنوان کے ذیل میں اس کتاب کے مباحث کا تجزیہ دوراز کار ہوگا۔ لیکن مصنفؒ نے حواشی میں علامہ شبلیؒ کی کتاب 'سیرۃ النعمان' کے بعض اہم مباحث پر بڑی قابل قدر گفتگو فرمائی ہے۔ اپنے علمی مشمولات کے باعث اہل علم کو اس کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ کا مشورہ دیا جاسکتا ہے۔ امید ہے موافق اور مخالف سبھی انشاء اللہ اس سے مستفید ہوں گے۔

'سیرۃ البخاری' اگرچہ 'سیرۃ النعمان' کے جواب میں لکھی گئی ہے، لیکن چونکہ یہ خود

سیرت کی ایک کتاب ہے، اس لیے اس میں 'سیرۃ النعمان' کے مباحث کا جواب نہیں ہے۔ البتہ حصہ دوم میں فقط چند عنوانات پر سرسری گفتگو کی گئی ہے جیسے:

مسند خوارزمی کی نسبت امام ابوحنیفہ کی طرف غلط ہے۔ تاریخ صغیر میں امام ابوحنیفہؒ کا تذکرہ۔ 'سیرۃ النعمان' میں امام بخاری اور دیگر مؤلفین صحاح کے اہل کوفہ سے حدیث روایت نہ کرنے کی دونوں وجہیں غلط ہیں۔ اس کی اصل اور واقعی وجہ۔ اهل الكوفة ليس علىٰ حديثهم نور''۔ عقود الجمال غیر معتبر کتاب ہے (حاشیہ میں)۔

واضح رہے کہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے 'سیرۃ النعمان' میں جس انداز سے محدثین اور اصول حدیث پر گفتگو فرمائی ہے وہ دیوبندی مکتب فکر کے بعض دیگر ترجمانوں کے نزدیک بھی پسندیدہ نہیں تھی۔ چنانچہ مولانا عبدالرؤف دانا پوریؒ نے 'اصح السیر' میں اور مولانا بدر عالم میرٹھیؒ نے 'ترجمان السنۃ' میں ان افکار وخیالات کی تصحیح کی کوشش فرمائی ہے۔ فجزاهم الله احسن الجزاء۔

علامہ شبلیؒ نے حدیث اور فقہ دونوں موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ مقالہ نگار نے طوالت کے اندیشے سے صرف حدیث اور اصول حدیث کا عنوان اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ علامہؒ کی گفتگو کی تلخیص اوپر پیش کی جا چکی ہے۔ اگر اسے مختصر کیا جائے تو ملحوظات شبلی کو تین نکات میں محدود کیا جا سکتا ہے:

(۱) احادیث کی ظنیت (۲) درایت (۳) فقہ راوی

'سیرۃ النعمان' پر علامہ شبلیؒ کے تین معاصرین کی آراء کا ذکر ہو چکا ہے۔ خوش قسمتی سے 'حسن البیان' کے طبع چہارم (۱۴۰۴ھ مطابق ۱۹۸۴ء) میں شیخ الحدیث مولانا حافظ محمد اسمٰعیل سلفی صاحب گوجرانوالہؒ کا ایک مبسوط اور فاضلانہ مقدمہ شامل کیا گیا ہے جس میں انہوں نے درایت اور فقہ راوی کے مسائل کا تاریخی وتحقیقی جائزہ لیا ہے۔ یہ مقدمہ علامہ شبلیؒ اور مولانا عبدالعزیز رحیم آبادیؒ دونوں کے دلائل کی تلخیص اور ان پر محاکمہ ہے۔ شیخ الحدیث ماہنامہ 'رحیق' (لاہور) کے مدیر رہے ہیں جس سے مولانا عامر عثمانیؒ جیسے ناقد عالم نے طالب علمانہ استفادہ کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا اسمٰعیل سلفی کی زبان انشاء اور ادب کا

بہترین نمونہ ہے۔ آپ کے طرز تحریر میں خاک ساری اور نیاز مندی بھی جھلکتی ہے۔ اس لیے اس مقدمہ کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

علامہ شبلیؒ کے افکار و خیالات کا اثر علمائے دیوبند ہی نہیں، بلکہ دیگر اصحاب علم پر بھی پڑا ہے جن میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے اپنے مقالہ 'مسلک اعتدال' (مشمولہ تفہیمات۔ حصہ اول) میں درایت اور ظنیت کی بحث چھیڑی ہے۔ مولانا سلفیؒ کے پانچ مقالات حجیت حدیث کے موضوع پر شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک میں مولانا مودودیؒ کے خیالات سے بھی تعرض کیا گیا ہے۔ ان کے عنوانات یہ ہیں:

(۱) حدیث کی تشریعی اہمیت (۲) جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث (۳) سنت قرآن کے آئینے میں (۴) حجیت حدیث آں حضرت ﷺ کی سیرت کی روشنی میں (۵) مسئلۂ درایت و فقہ راوی کا تاریخی و تحقیقی جائزہ (یہی مقالہ 'حسن البیان' کا مقدمہ ہے)۔

مولانا سلفی مرحوم نے پہلے اور دوسرے مقالہ میں حدیث کی ظنیت اور آخری مقالہ میں درایت اور فقہ راوی پر گفتگو فرمائی ہے۔ اس لیے مقالہ نگار مذکورہ سہ نکات پر معاصرین شبلی کی تینوں تصنیفات سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف مولانا سلفیؒ کی تحریروں کی روشنی میں علامہ شبلیؒ کے افکار کا جائزہ لے گا۔

مولانا سلفیؒ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ علمائے حدیث علم حدیث کو ایک متحرک علم سمجھنے کے باوجود ہر پہلو سے بحث و نظر کے بعد محسوس کرتے ہیں کہ ضرورت کے مطابق فن کی تکمیل ہو چکی ہے۔ اس کا معاملہ صرف و نحو اور معانی و بیان کا سا ہے کہ یہ فن قریب قریب کافی حد تک مکمل ہیں [۱۵]۔ ان کے نزدیک اصول حدیث میں اضافہ یا ان پر تنقید شرعاً ممنوع نہیں ہے، لیکن ان کا خیال ہے کہ حدیث کی چھان پھٹک اور اس کے قواعد اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ مزید بحث بے ضرورت ہے۔ [۱۶]

آپ نے لفظ 'ظن' کی علمی تحقیق فرمائی ہے اور بتلایا ہے کہ اردو زبان میں اس کا استعمال عموماً 'مشکوک' 'موہوم' اور 'مظنون' وغیرہ کے مترادف ہوتا ہے۔ لیکن عربی

زبان میں یہ لفظ بلاقرینہ اس معنٰی میں استعمال نہیں ہوا۔ مولانا مرحوم نے لغات میں مفردات امام راغب، لسان العرب، تہذیب الصحاح، اقرب الموارد، قاموس اور المنجد کے حوالے دیے ہیں اور مفصل زمخشری کے شارح ابن یعیش سے استدلال کیا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ لفظ 'ظن'، 'یقین' اور 'شک' دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ یقین استدلالی ہوتا ہے، عیانی نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں دونوں کی بہت سی مثالیں ہیں۔ مولاناؒ نے ظن بمعنی 'یقین' کے لیے قرآن سے سات اور بمعنی ''شک'' کے لیے تین مثالیں پیش کی ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُلَاقُوا رَبِّھِمْ وَاَنَّھُمْ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (البقرہ۔ ۴۶) ''جن کو یقین ہے کہ بے شک وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے اور یقیناً وہ اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں''۔

(۲) اَلَا یَظُنُّ اُولٰئِکَ اَنَّھُمْ مَبْعُوْثُوْنَ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ (المطففین۔۴،۵) ''کیا انہیں اپنے مرنے کے بعد جی اٹھنے کا یقین نہیں اس عظیم دن کے لیے''۔

(۳) وَظَنَّ اَنَّہُ الْفِرَاقُ (القیٰمہ۔۲۸) ''اور یقین ہو گیا کہ بے شک اب جدائی ہے''۔

(۴) وَظَنُّوْا اَنَّھُمْ مَانِعَتُھُمْ حُصُوْنُھُمْ (الحشر۔۲) ''انہیں یقین تھا کہ ان کے قلعے انہیں اللہ کے عذاب سے بچالیں گے''۔

(۵) اِنَّا ظَنَنَّا اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰہَ فِی الْاَرْضِ (الجن۔۱۲) ''ہم کو یقین تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کو زمین میں ہرگز عاجز نہیں کر سکتے''۔

(۶) وَاَنَّھُمْ ظَنُّوْا کَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّبْعَثَ اللّٰہُ اَحَدًا (الجن۔۷) ''اور (انسانوں) نے بھی تم جنوں کی طرح یقین کر لیا تھا کہ اللہ کسی کو نہ بھیجے گا (یا کسی کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا''۔

(۷) بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰی اَھْلِیْھِمْ اَبَدًا (الفتح۔۱۲) ''نہیں بلکہ تمہیں یہ یقین تھا کہ پیغمبر اور مسلمانوں کا اپنے گھروں کی طرف لوٹ آنا قطعاً ناممکن ہے''۔

قرآن کریم میں جہاں ظن کو حق کے مقابل ذکر کیا گیا ہے وہاں اس کے معنی شک اور وہم کے ہیں، جیسے:

(۱)اِنَّ الظَّنَّ لَایُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئاً (النجم۔۲۸)''بے شک وہم (وگمان) حق کے مقابلہ میں کام نہیں دیتا''۔

(۲) اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَاتَھْوَی الْاَ نْفُسُ (النجم۔۲۳)''یہ لوگ اٹکل کے اور اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں''۔

(۳)اِنْ نَّظُنُّ اِلَّاظَناً وَّمَانَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ (الجاثیہ۔۳۲)''ہمیں کچھ یوں ہی سا خیال ہو جاتا ہے، لیکن ہمیں یقین نہیں''۔[۱۶]

مقالہ نگار کا اضافہ:

حماسی شاعر کہتا ہے۔

فقلت لھم ظنوا بالفی مد جج سراتھم فی الفار سی المسرد

''میں نے (اپنے قبیلہ والوں کو) خبردار کیا کہ تم یقین کرو کہ (دشمنوں کا) دو ہزار آہن پوش لشکر جس کا سردار فارسی میں ملبوس ہے (صبح ہی صبح تمہارے اوپر ٹوٹ پڑنے والا ہے)''۔

اس کے بعد آپ نے شریعت اسلامیہ میں ظن کی اہمیت پر مفصل گفتگو فرمائی ہے اور اس کی مثالیں بھی دی ہیں۔ انہیں مقالہ نگار اپنے الفاظ میں اور قدرے اضافہ کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

(۱) استقراء واستخراج اور ادلۂ منطقیہ (logical analogies) ظنی ہیں، بلکہ دنیا کے کتنے ہی علوم کا انحصار اس ظن پر ہے۔

(۲) کسی مستقیم شے کو پانی میں ڈال دیجئے وہ سطحِ آب سے نیچے زاویہ کی شکل میں (Slanted) دکھائی دے گی۔ یقین کہاں رہ گیا؟

(۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں، چاند اور سورج کے ڈوبنے سے ان کے خدا نہ ہونے پر دلیل قائم کی۔ یہ خالص ظن تھا۔

(۴) ججوں اور قاضی کے فیصلے ظن کی بنا پر صادر ہوتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے بعض اپنا عندیہ بڑی فصاحت اور بلاغت سے بیان کرتے ہیں۔ میں ان کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں۔ لیکن واقعۃً وہ فیصلہ درست نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ میرا فیصلہ حرام کو حلال نہیں کر سکتا''۔ حضورؐ خود جب اپنے فیصلہ کے بارے میں یہ ارشاد فرمائیں تو قطعیت کہاں سے آئے گی؟

(۵) پورا قانون شہادت (Law of Evidence) ظن پر مبنی ہے۔ اس قانون کی تمام دفعات شک کو یقین میں بدلنے کی کوشش سے عبارت ہیں۔

(۶) دنیا امید پر قائم ہے۔ آدمی تجارت بھی ظنی نفع کی بنیاد پر کرتا ہے۔ تحصیل علم مستقبل کے ظنی فوائد کے حصول کے لیے ہے۔ نسب بھی ظن ہی سے ثابت ہوتا ہے۔

(۷) اگر حاجی کسی جانور کا شکار کر گذرے تو اس کے عوض اسی طرح کا جانور فدیہ میں دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ یَحْکُمُ بِہٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْکُمْ ھَدْیًا بَالِغَ الْکَعْبَۃِ (المائدہ۔۹۵)۔ ''تو اس پر فدیہ واجب ہوگا جو کہ مساوی ہوگا اس جانور کے جس کو اس نے قتل کیا ہے جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کر دیں۔'' یہ حکم بھی ظنی ہے کہ آیا جانور شکار کے مثل ہے یا نہیں؟

(۸) فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ اَھْلِہٖ وَحَکَمًا مِّنْ اَھْلِھَا. اِنْ یُّرِیْدَا اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا (النساء۔۳۵) ''ایک منصف مرد والوں میں سے اور ایک عورت والوں میں سے مقرر کرو۔ اگر یہ دونوں صلح کرانا چاہیں گے تو اللہ دونوں میں ملاپ کرا دے گا''۔ اس شرط میں تحکیم کی ظنیت ظاہر ہے۔[۱۸]

(۹) علم غیب اور تقدیر پر ایمان بر بنائے ظن ہے۔ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (الفاتحہ۔۴) میں دین بمعنی قیامت۔ اس کا مالک اللہ ہے۔ کیا یہ عینی شہادت ہے؟ لیکن قیامت کا عقیدہ دین کی بنیاد ہے۔

(۱۰) قرآن کے قطعی الثبوت ہونے کی بنیاد بھی احادیث ہیں۔ پھر قرآن بھی ظنی ہوا۔

اس کے بعد حافظ ابن رجب حنبلیؒ کا قول نقل کرتے ہیں: **والشارع لم یکلف العباد بما فی نفس الامر بل بما ظهر وبدء وان کان مخالفا لنفس الامر القواعد** یعنی 'شارع نے اپنے بندوں کو یہ تکلیف نہیں دی کہ وہ نفس الامر کی تلاش کریں بلکہ اس کی جو کچھ بظاہر موجود ہو گو وہ نفس الامر اور واقع کے خلاف ہو'۔

اور گفتگو کو قرآن کی اس آیت پر ختم کرتے ہیں لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ ۲، ۲۸۶) ''اللہ نے انسان کو اس کی وسعت اور توفیق کے مطابق تکلیف دی ہے''۔[۱۹]

درایت اور فقہ راوی کے عنوان سے مولانا سلفی کا جو مقالہ ہے وہ 'احسن البیان' میں بطور مقدمہ کے موجود ہے۔ لیکن اس مقالہ میں حوالے اس کتاب کے بجائے 'حجیت حدیث' سے لیے جائیں گے۔

مولاناؒ نے فقہ کی لغوی اور اصطلاحی حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے 'فقہ الاجتہاد' اور 'فقہ التقلید' کا فرق واضح کیا ہے۔ آپؒ نے شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ، علامہ ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے علاوہ ترکی عالم شیخ حسین آفندی الجسری کی آراء سے استدلال کرتے ہوئے فقہ الاجتہاد کی عمر چوتھی صدی کے آخر تک بتائی ہے۔ اس کے بعد فقہ التقلید کی ابتدا ہوتی ہے جس کے بارے میں صاحب 'مسلم الثبوت' کی رائے نقل کی ہے: ''فقہ فروع شرعیہ حقیقیہ کا نام ہے۔ پس مقلد کو فقیہ نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اسے حقیقت تک رسائی کی ہمت ہی نہیں، نہ اسے اجازت ہے کہ ادلّہ تفصیلیہ میں فقہ و درایت کی روشنی میں غور کرے''۔[۲۰]

اصحاب الحدیث اور ارباب فقہ کے فہم و فراست کے تعلق سے آپ کا خیال ہے کہ ''اس میں مراتب کا تفاوت تمام طبقات میں پایا جاتا ہے۔'' بعض لوگوں کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ ''جس فنی فقہ پر اس قدر ناز کیا جا رہا ہے اس کا جاننا کوئی خاص خوبی ہے نہ اس سے محروم رہنا کوئی بہت بڑا عیب ہے۔ فنی فقہ کے جاننے والوں میں بعض حشوی اور ظاہر پرست ہیں اور بعض دقیق النظر۔ اسی طرح ائمۂ حدیث میں دونوں طرح کے لوگ ہیں۔ یہ کوئی قانون نہیں جو آپ حضرات

کے نوک قلم پر بار بار آ رہا ہے۔ آپ لوگوں کی جدید تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ حضرات میں سے اکثر حشوی اور ظاہری ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کی ظاہریت فقہ کی شروح اور متون میں محصور ہے اور امام داؤد اور ابن حزم کی ظاہریت قرآن وسنت میں محدود ہے''۔[۲۱]

ارباب تقلید کے حلقہ میں فقہاء کو حکیم اور محدثین کو عطار کہا جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ''کم وبیش تمام طبقات میں سادہ لوح اور ظاہر بیں پائے گئے ہیں۔ یہ عطار اور حکیم کی مثال بھی اسی نوعیت کی ہے۔ مروجہ فقہی مسالک احناف، شوافع اور موالک میں بھی بڑے بڑے 'عطار' موجود ہیں۔ قدرے سن بھی لیجئے''۔ اس کے بعد آپ نے فقہ حنفی سے سات مثالیں پیش کی ہیں۔

(۱) طہارت کے باب میں پانی کی طہارت کا مسئلہ کس قدر سطحی ہے۔ پانی کی مقدار میں 'دہ دردہ' کا تعین بالکل غیر فقہی ہے.....بعض آثار میں گندے کوڑے کرکٹ کو کنویں کے منہ سے دس ہاتھ دور رکھنے کی ہدایت سے مقدار کا تعین اور پانی جیسی سیال چیز کو اس پر قیاس کرنا، اس میں کون سی فقہ ہے؟

(۲) پھر کنویں کے پانی کی مقدار کو بالکل ہی نظر انداز کر دینا اور بعض غیر مستند آثار پر اس کی بنیاد رکھنا بالکل ظاہریت ہے.....(شامی ۱/۱۱۷، قاضی خاں ۱/۷)

(۳) موطوٴہ لونڈی سے اثباتِ نسب کے لیے دعویٰ کی ضرورت پر زور اور مشرق ومغرب میں کسی عورت سے نکاح اور ملاقات کے متعلق یقین ہو کہ نہیں تو بھی نسبت ثابت ہوجائے گی۔ (شامی ۲/۹۷۴)۔ یہ درایت کی کون سی قسم ہے؟ اور اس پر حدیث الولد للفراش سے استدلال بڑی شنیع قسم کی ظاہریت ہے۔ ابن حزم کی ظاہریت بھی اس کے آگے سرنگوں ہوگئی۔

(۴) ذکوان مولیٰ حضرت عائشہؓ قرآن کریم دیکھ کر امامت کرتے تھے۔ اسے عمل کثیر کی وجہ سے ناپسند کیا اور نماز کو فاسد قرار دیا گیا۔ لیکن عورت کے اندام نہانی کو غلط انداز سے دیکھے تو نماز میں کوئی خلل نہ ہوگا (قاضی خاں، ۱/۱۱۱۔ اشباہ)۔ یہ کہاں کا تفقہ

ہے؟ ان جزئیات کو پوری عقیدت سے قبول فرما کر محدثین کو عطار کہنا دانش مندانہ انداز فکر نہیں ہے۔

(۵) محرمات ابدیہ سے نکاح کے ذریعہ منہ کالا کرنے کے بعد شبہ فی المحل کی بنا پر اسے حد سے بچانا ادرء وا الحدود بالشبہات کی بحث کرنا۔ اس میں ہمیں تو تفقہ سمجھ میں نہیں آتا۔ (قاضی خاں ۱/۳۲۴)

(۶) خمر کے متعلق جس وسعت سے فقہ حنفیہ نے پر مٹ دیے ہیں اور خمر کی مختلف اقسام کے احکام جس حوصلہ مندی سے نافذ فرمائے ہیں اس سے حدیث یسمونہ بغیر اسمہ کی تصدیق تو ہوتی ہے، مگر تفقہ فی الدین کا اس سے ثبوت نہیں ملتا۔ عام حلال وحرام میں احتیاط کے لحاظ سے احناف خاصے نیک نام تھے۔ لیکن یہ نیک نامی اور احتیاط شراب میں قائم نہیں رہ سکی، بلکہ اہل علم میں غیر محتاط روش کی نظیر بن گئی۔

(۷) نکاح حلالہ کو ناجائز اور حرام سمجھنے کے باوجود یہ فتویٰ کہ اس سے پہلے خاوند کے لیے بیوی حلال ہو جائے گی، غایت درجہ کی سطحیت ہے۔ اس کی تائید روایت سے ہوتی ہے نہ درایت سے۔ اس تاویلی زنا کا جواز تقلید ہی کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ ۲۲

مقالہ نگار کا اضافہ:

(۸) حدیث رکانہ ۲۳ کے تحت ایک طلاق کی نیت سے تین مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرنے پر ایک کے بجائے تین طلاق واقع ہونے پر اصرار، اور حلالہ جیسی حرامہ کے حیلہ کا جواز حشویت کی ایک مکروہ شکل ہے۔ اس نے موجودہ زمانہ میں بہت ناگوار صورت حال پیدا کر دی ہے۔

(۹) بعض محرمات کے زنا سے بیوی کا شوہر پر حرام ہو جانا کون سے دلائل عقلیہ پر موقوف ہے، جب کہ نکاح پہلے ہوا ہے اور زنا کا وقوع بعد میں۔ یہ حشویت ایسی ہی ہے جیسے شوافع کے یہاں اپنی ہی ولد الزنا سے نکاح کا جائز ہونا۔

(۱۰) فاتحہ خلف الامام کے جواز سے انکار اور فجر کی سنتوں کو جماعت کی موجودگی میں ادا کرنے کی ترغیب۔ اس میں کون سی معقولیت ہے۔ جب کہ جماعت کی موجودگی میں

کسی دوسری نماز کی نفی کی گئی ہے۲۴ اور فجر کی جماعت کے بعد سنتوں کے پڑھنے کا جواز رسول کریم ﷺ کی حدیث تقریری سے ثابت ہے۔ ۲۵

(۱۱) حضرت عائشہؓ کے ایک اثر سے استدلال کرتے ہوئے خواتین پر مسجدوں کے دروازے بند کر دینا، جب کہ انہیں مسجدوں میں جانے کی واضح طور سے اجازت ہے۲۶۔ یہ استحسان کے ذریعہ حدیث کو قتل کرنا ہے۔ آج کے زمانہ میں، جب کہ عورتیں ہر کام کے لیے گھروں سے نکلنے کے لیے آزاد ہیں، مسجد میں ان کی نمازوں پر قدغن لگانا کسی درایت کے تحت نہیں آتا۔

لفظ 'درایت' کی تحقیق مولانا مرحوم نے لغات معتبرہ یعنی المنجد، القاموس، المحیط، المصباح اور المنیر کی مدد سے کرنے کے بعد اصطلاحی مفہوم کے لیے کشف الظنون (حاجی خلیفہ)، ابجد العلوم (نواب صدیق حسن خاں)، مفتاح السعادۃ (مصطفیٰ طاش کبریٰ زادہ) کے اقتباسات کے حوالوں سے چار نتائج برآمد کیے ہیں، جس کا ملخص یہ برآمد ہوتا ہے کہ اس فن کا وجود روایت بالمعنی میں حقیقی معنیٰ و مراد تک پہنچنے کے لیے ہوا ہے۔ اس سے معنیٰ و مفہوم کی پیچیدگیاں رفع ہوتی ہیں۔ رجال کے مباحث میں بھی معانی اور مفہوم اور بعض تاریخی مباحث پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے نسخ کے مباحث میں بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ طبری، البدایہ والنہایہ اور مسعودی وغیرہ میں اسانید کا اہتمام دراصل معاملات کی درایت کی خاطر ہی ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں: ''فن درایت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات درایت کی وجہ سے ایسے قرائن جمع ہو جاتے ہیں جن کی بنا پر اخباری روایات کو حدیثی روایات پر ترجیح دینا درست معلوم ہوتا ہے۔ درایت کی تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن میں اہم فائدہ یہی ہے''۔ ۲۷

اس کے بعد لکھتے ہیں: ''محض شخصی عقل اور تجربہ قرائن کی بنیاد نہیں ہونا چاہئے، بلکہ اساس پھر بھی روایت اور واقعات پر ہونی چاہئے۔ عقلی استحالات ایک مستند قصہ کی تغلیط کے لیے کافی نہیں، بلکہ اگر صحیح روایات کی تغلیط محض عقلی احتمالات سے کی جائے تو اس کا مطلب روایت اور رواۃ دونوں کی تکذیب کرنا ہوگا۔ اور اگر ان قرائن کی بنیاد کوئی دوسری

حدیث ہو تو اعتماد روایت پر اور قرائن ترجیح کا موجب ہوں گے''۔۲۸

علمائے عراق نے فرمایا ہے کہ وہ مراسیل کو بھی حجت سمجھتے ہیں (بحوالہ شامی)۔ مسئلہ یہ ہے کہ مرسل کو حدیث کہنا کہاں تک درست ہے۔ (پھر مراسیل کو حجت سمجھنا اور مرفوعات پر درایت کی قینچی چلانا کہاں کا انصاف ہے؟۔ مقالہ نگار) دراصل ائمہ حدیث نے درایت کا جو استعمال کیا وہ اس خطرہ سے بچنے کے لیے کیا'' تا کہ نقل احادیث میں علماء کی طغیانیاں اصل مقصد کو بہا کر نہ لے جائیں اور مراسیل ومقطوعات کی آڑ میں موضوع اور مختلط چیزیں آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب نہ ہو جائیں۔ اس حفاظتی تصور کا نام ''درایت'' رکھا گیا۔ اور زیادہ تر اس کا انحصار لغت اور علوم لسانیہ پر رکھا گیا، تا کہ روایت کا مفہوم صحیح طور سے آگے منتقل ہو''۔۲۹

علامہ شبلیؒ نے درایت کی یہ تعریف فرمائی تھی: ''درایت کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو اس پر غور کیا جائے کہ وہ طبیعت انسانی کے اقتضاء، زمانہ کی خصوصیات، منسوب الیہ کے حالات اور دیگر قرائن عقلی کے ساتھ کیا نسبت رکھتا ہے''۔

مولانا اسمٰعیل صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ''اقتضائے طبیعت وہی نیچر کا ترجمہ ہے۔ سرسید کا بھی یہی خیال تھا کہ نیچر کے خلاف کوئی چیز قبول نہیں ہوسکتی''۔ آگے فرماتے ہیں: ''اس میں درایت کا مفہوم اس قدر آزاد کر دیا گیا ہے کہ اس پر کوئی پابندی نہیں رہی۔ اقتضائے طبیعت کی حد اور اس اقتضائے کا معیار کیا ہے؟ اور عقلی قرائن کی تعیین کون کرے؟ کیسے کرے؟ زمانہ کی خصوصیات، نصوص کی راہ میں حائل ہوسکتی ہوں تو پرویز کے جرم پر بھی نظر ثانی ہونی چاہئیے''۔ پھر فرماتے ہیں ''عقل کو اس قدر وسیع اختیارات نہ قاضی عیسیٰ بن ابان نے دیے تھے نہ معتزلہ کو یہ حوصلہ ہوا تھا۔ یہ گنوار کے ہاتھ کسوٹی اور پاگل کے قبضہ میں تلوار دے دی گئی ہے۔ جو ان کے جی میں آئے کریں۔ دین کا خدا حافظ''۔۳۰

مولانا اقتضائے طبیعت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ ''بالکل مہمل جملہ ہے۔ طبائع کے اقتضاء میں اتنا ہی اختلاف ہے جس قدر خود انسانی طبائع میں۔ اقتضاء، طبائع کے تابع ہے، یہ تنقید کا معیار کیسے ہوگا؟ بے دین طبائع کے تقاضے دینی طبائع سے مختلف

ہوں گے۔ عالم اور بے عمل کے مقتضیات بھی مختلف ہوں گے.....ان تقاضوں کی صحت خود محل نظر ہے۔ یہ کسی دوسری چیز کے لیے قانون کیسے بن سکیں گے؟..... ہر زمانہ کے خصائص الگ الگ ہوتے ہیں۔ قرون خیر کے خصائص بعد کے قرون سے کافی حد تک مختلف ہیں..... اس وقت کے حوادث کو آج کے قرائن سے کیسے پرکھا جائے جب کہ زمانہ کی خصوصیات مختلف ہیں..... جب واقعہ ہو قدرتی طور پر حقیقت پسند طبائع قرائن اور منسوب الیہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ لیکن یہ جائزہ عقلی قرائن کا استعمال صدیوں بعد نہیں ہونا چاہئے..... پھر عقلی قرائن کیا چیز ہیں؟ اگر کتاب وسنت اصل ہیں تو معیار ان کو ہونا چاہئے۔ عقل بھی وہی درست ہوگی جو اس پیمانہ سے ناپی جائے''۔[۳۱]

مولاناؒ آگے لکھتے ہیں: ''معلوم ہوتا ہے مولانا شبلی سرسید سے متأثر ہوئے۔ مولانا نے سرسید سے جو تأثر لیا انہوں نے اسے اصطلاحاً علمی انداز دیا''۔[۳۲]

مولانا سلفی کا خیال ہے کہ بریلوی حضرات ''اس مصنوعی درایت سے بہت کم متأثر ہوئے (کیونکہ) اس درایت سے معجزات، کرامات اور فقیروں کے فرضی قصوں کا بھی خاتمہ ہوتا تھا۔ اس لیے انہوں نے اسے قابل قبول نہیں سمجھا'' لیکن مولانا کے نزدیک حضرات دیوبند کے سنجیدہ اور دور اندیش بزرگوں نے اس درایت کو اہل حدیث ہی کی طرح ناپسند کیا اور اس کے خلاف لکھا..... لیکن بعض دیوبندی اہل قلم اس سے متأثر ہوئے اور یہ اس لیے کہ اس نظریہ سے احناف میں قلت حدیث کا جو خلا تھا اسے درایت سے پاٹنے کی کوشش کی گئی ہے..... فقہاء کے لیے اس مصنوعی اور ظاہری تفوق سے یہ حضرات مطمئن ہو گئے اور یہ غور نہ فرما سکے کہ یہ دراصل انکار حدیث کا زینہ ہے''۔[۳۳]

فقہ راوی کے ذیل میں مولانا سلفی لکھتے ہیں؛

''جن مقاصد کے لیے بعض اہل علم نے درایت کی ضرورت کو محسوس فرمایا انہی مقاصد کے لیے فقہائے عراق نے فقہ راوی کی قید لگائی، تاکہ نصوص کا مفہوم صحیح ادا ہو اور روایت بالمعنی میں اس سے مدد مل سکے..... گو درایت اور فقہ (راوی) کے مصطلح مفہوم میں فرق ہے، لیکن مفہوم کے ادا میں دونوں ذرائع سے استفادہ کیا جاسکتا ہے.....

(حالانکہ) ائمۂ حدیث اور فقہائے محدثین اس قسم کی قیود سے بے نیاز تھے۔ اسانید کے ضبط اور متون میں مختلف الفاظ کے حفظ وادا سے ان کی طبائع میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے وہ فنی لطافتوں کے علاوہ ذوقی طور پر سمجھتے تھے۔ اور ہر صاحب فن کا اپنے فن میں یہی حال ہوتا ہے۔ وہ فن کی لطافتوں کو ذوق سے سمجھتے ہیں'' ۳۴؎

مولانا سلفیؒ کے نزدیک فنی لطافتوں کا یہ ذوق مولانا مودودیؒ کے اس ذوق سے الگ ہے جس میں مولانا مودودیؒ نے فقہاء کی حدیث شناسی کو رسول کی مزاج شناسی سے تعبیر کیا تھا، اور حدیث کو ظنی قرار دیا تھا۔ ۳۵؎

نکاتِ معارضہ

(۱) احادیث کی مظنونیت کوئی نئی دریافت نہیں ہے۔ محدثین نے ظن کو دین میں معتبر سمجھنے کے باوجود اس کو یقین عیانی کے بجائے یقین استدلالی کے لیے استعمال کیا ہے۔

(۲) درایت کا موجودہ مفہوم درست نہیں ہے۔ اس سے فتنۂ انکار حدیث کو تقویت پہنچتی ہے۔ یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ ائمۂ حدیث نے درایت کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔

(۳) فقہ راوی کو ائمۂ حدیث نے جن معنوں میں استعمال کیا تھا ان سے ہٹ کر اس دور میں اسے بعض اجلّۂ صحابہ اور رواۃ کی تضعیف وتحقیر کا کام لیا گیا۔

(۴) بعض فقہی اصول قلت حدیث کے ضعف کو کم کرنے کے لیے ہیں۔

(۵) جس طرح فقہائے کرام حدیث سے بیگانہ نہیں تھے، اگرچہ اس فن میں ہر ایک کا مرتبہ یکساں نہیں تھا، ویسے ہی محدثین کرام مختلف درجوں میں فقیہ تھے۔ ان کا معاملہ حکیم اور عطار کا نہیں تھا۔ صحاح میں خصوصیت سے بخاری اور ترمذی اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

حاصل معارضہ:

علامہ شبلیؒ آخر عمر تک پرورش لوح وقلم کرتے رہے، لیکن اپنے قرطاس وقلم کو پھر کبھی اختلافی مسائل سے آلودہ نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ تمام مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اللھم اغفرلہم وارحمہم۔ آمین۔

حواشی ومراجع

۱ شعرالعجم کی طرف اشارہ ہے۔

۲ سیرۃ النعمان۔ص۸۵(طبع قدیم) اس کتاب کا جونسخہ مقالہ نگار کو حاصل ہوا اس کے شروع کے دواوراق غائب ہیں اس لیے سنہ طباعت معلوم نہیں ہوسکا۔اس کے ہرصفحہ کے سرے پر'امام ابوحنیفہ' لکھا ہوا ہے۔

۳ ترمذی عن حدیث عبداللہ بن مسعود۔ج۲۔ص۱۰۹

۴ سیرۃ النعمان۔ص۸۶ ۵ ایضاً،ص۸۷ ۶ ایضاً،ص۸۹

۷ ایضاً،ص۹۰ ۸ ایضاً،ص۹۰ ۹ ایضاً،ص۹۱

۱۰ ایضاً،ص۹۲ ۱۱ ایضاً،ص۹۴ ۱۲ ایضاً،ص۹۴

۱۳ ایضاً،ص۹۵

۱۴ علامہ ناصر الدین البانیؒ نے آحاد سے عقیدہ کے اثبات کے لیے بیس دلائل دیے ہیں۔ دیکھیے مقالہ دوم۔مشمولہ کتاب ''حجیت حدیث'' (جامعہ سلفیہ بنارس،۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۵ء۔

۱۵ حجیت حدیث۔بنارس۔ص۲۰۷(ملخص)

۱۶ ایضاً،ص۲۰۸ ۱۷ ایضاً،ص۱۶۷

۱۸ ایضاً،ص۱۶۷تا۱۷۱(ملخص) ۱۹ ایضاً،ص۱۷۲

۲۰ ایضاً،ص۔۳۶۸تا۳۷۱(ملخص) ۲۱ ایضاً،ص۳۷۸

۲۲ ایضاً،ص۳۷۵تا۳۷۶

۲۳ دارقطنی ۱/۳۸۳۔۳۸۴، بیہقی ۲/۲۸۳، ابن خزیمہ ۱۱۶(ابن حبان، حاکم اور ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے)

۲۶ ابو داؤد عن عبداللہ بن عمرؓ، ترمذی۔ باب خروج النساء الی المسجد باللیل۔ بخاری۔ ترجمۃ الباب۔باب خروج النساء الی المساجد، جمعہ کی نماز میں عورتوں کو مسجد میں لے جانے کا حکم ترمذی اور ابن ماجہ میں بھی ہے۔

۲۷ حجیت حدیث۔ص۳۸۱ ۲۸ ایضاً،ص۳۸۱ ۲۹ ایضاً،ص۳۸۲

۳۰ ایضاً،ص۱۹۱ ۳۱ ایضاً،ص۳۹۵۔۳۹۶ ۳۲ ایضاً،ص۳۹۶

۳۳ ایضاً،ص۳۹۸ ۳۴ ایضاً،ص۳۸۳ ۳۵ ایضاً،ص۲۶۷

تذکرہ علمائے مالابار
چند ممتاز مصلحین امت

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

دیار مالابار میں علمائے اسلام نے ایک طرف پرتگالی اور انگریزی استعمار سے کھل کر ٹکر لی اور اس جہاد میں ہزاروں ماپلا مسلمانوں نے شہادت حاصل کی اور دوسری طرف انہوں نے مسلمانوں کے اندر تعلیمی تحریک پیدا کی۔ انہوں نے پہلے اسلامی مدارس کھولے، پھر جدید تعلیم کی طرف توجہ کی۔ اس سلسلہ میں یہاں بعض ممتاز علماء کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

ولین کوٹ عمر قاضی ۱۷۸۷ء-۱۸۸۲ء

عمر قاضی تحصیل پُنّانی ضلع ملاپُرم کے ایک قصبہ ولین کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کی خاندانی وجاہت اور علمی اہمیت مسلّم رہی ہے۔ ان کے والد کا نام قاضی یاراکٹ ککّا ٹارایل علی مصلیار QAZI YARAKATT KAKKATTARAYIL ALIMUSLIAR تھا۔ وہ حکومت کی طرف سے ولین کوٹ کے قاضی تھے۔ ان کے بچپن ہی میں والدین انتقال کر گئے اور چچا نے ان کی پرورش کی۔ ان کی تعلیم مسلمانوں کے مرکز پُنّانی میں ہوئی۔ ان کے استاذ مشہور عالم غزالی مصلیار تھے جو مّی کُٹی ترورنگاڈی (TRIRURANGADI) اور کنڈوٹی کے قاضی تھے۔ ان کی ایک عربی نظم کنڈوٹی کی پزین گاڈی مسجد (Pazhayan Gadi) پر کندہ ہے۔ قاضی عمر نے قاضی غزالی مصلیار سے تفسیر، فقہ اور تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ وہ امام غزالی کی کتاب احیاء علوم الدین سے بہت متاثر ہوئے۔ جب ان کے استاذ غزالی بیمار ہوئے تو وہ برابر ان کی خدمت کرتے رہے اور ان کی وفات پر عربی زبان میں ان

کا مرثیہ لکھا۔

عمر قاضی نے بہت سی نظمیں عربی اور ملایالم دونوں زبانوں میں لکھی ہیں۔ان کا قصیدہ 'نفائس الدرر' عربی میں فلسفیانہ انداز کا ہے۔ انہوں نے ایک نظم 'مقاصد النکاح' لکھی۔ جب وہ حج کرنے گئے تو وہاں مکہ اور مدینہ کے شعراء اور ادباء سے ملے اور ان کا ان سے گہرا تعلق پیدا ہوا۔ جب وہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں قصائد پڑھتے تو فرطِ محبت وتعلق سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے..ان کی نظم آنحضرت ﷺ کی تعریف میں' ﷺ' کے عنوان سے شائع ہوچکی ہے۔ایک نظم انہوں نے ۱۸۳۲ء کے زلزلہ پر بھی لکھی ہے ۔ایک نظم نمازِ عصر کے صحیح وقت کے تعین پر لکھی ہے۔انہوں نے بہت سے فتاویٰ بھی وقت کے اہم مسائل پر جاری کئے ہیں۔

شہر پُنّانی کے آس پاس کے مسلمانوں میں خاندان پر فخر کا احساس پیدا ہوگیا تھا جس پر عمر قاضی نے ایک نظم لکھ کر ان کو یاد دلایا کہ تم سب اصلاً ہندوؤں کی نیچی ذاتوں سے ابھر کر اوپر آئے ہو۔ پھر فخر کیسا؟ ذات نہیں بلکہ اچھے اعمال باعث فخر ہیں۔ یہی اصل خوشی اور مسرت کی بنیاد ہیں۔

عمر قاضی دراصل عوامی رہنما تھے۔انہوں نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔انہوں نے کسانوں سے کہا کہ زمین دار اور حکومت والے اگر تم پر ظلم کریں تو ان کا مقابلہ کرو۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ جو لگان بڑھا دیا گیا ہے اس کو ادا نہ کیا جائے۔حکومت نے اس مسئلہ کو کسانوں کا مسئلہ نہیں، بلکہ نظم ونسق کا انتظامی مسئلہ قرار دیا اور قاضی عمر کو بلایا۔ جب وہ ڈپٹی کلکٹر کے پاس پہونچے تو فوراً ان کو گرفتار کرلیا گیا۔ یہ واقعہ چاوَکاڈ (CHAVAKKAD) میں پیش آیا، مگر صبح سے پہلے وہ آزاد ہوکر اپنے گھر پہونچ گئے۔ وہ دوبارہ کالی کٹ بلوائے گئے۔ وہاں کلکٹر نے ان کو گرفتار کرلیا۔جیل میں انہوں نے ایک قصیدہ لکھا جس میں وہ تمام تفاصیل لکھیں جو ان کی گرفتاری کے اسباب بنے۔نظم کے آخر میں انہوں نے اعلان کر دیا کہ مسلمانوں کو ظلم میں رہنا ٹھیک نہیں، ان کو جہاد کرنا چاہیے، تاکہ ظلم مٹ جائے، ان کو ظالموں کے خلاف جہاد کر کے شہادت کی موت حاصل کرنی چاہئے۔ ماپلاّ مسلمانوں نے

متحد ہوکر آواز اٹھائی اور مطالبہ کیا کہ عمر قاضی کو آزاد کیا جائے۔ یہ تحریک اتنی پُر زور تھی کہ کلکٹر نے محسوس کرلیا کہ عمر قاضی کو جیل میں رکھنا بغاوت کو دعوت دینا ہے، چنانچہ اس نے ان کو اکتوبر ۱۹۰۳ء میں چھوڑ دیا۔ وہ سلین کوٹ کے قاضی مقرر ہوئے۔ انہوں نے عربی اور ملایالم میں بہت سی نظمیں لکھیں اور نثر میں بھی تصانیف یادگار چھوڑیں۔ آخر میں ان کو سید علوی تھنگل ممران سے بڑا تعلق ہوگیا تھا۔ سید علوی تھنگل نے اس تحریک کی قیادت کی تھی جس کے دباؤ سے قاضی عمر کو حکومت نے رہا کیا تھا۔ قاضی عمر نے ان کے انتقال پر ایک عمدہ مرثیہ لکھا۔ قاضی عمر نے طویل اور پر از نشاط زندگی گذاری۔ وہ ۹۵ برس زندہ رہے۔ ان کا انتقال ۱۸۸۲ء میں ولین کوٹ میں ہوا۔

سید ثناء اللہ مکتی تھنگل (Sayyid Sanaullah Makti Thangal) (۱۸۴۷ء-۱۹۱۲ء)

ثناء اللہ مکتی تھنگل کیرالا کے مذہبی اور سوشل مصلح تھے۔ وہ ولین کوٹ میں ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر چاؤ کاڈ پرائمری اسکول سے چوتھی کلاس پاس کی۔ مذہبی تعلیم انہوں نے کُکّر (Kokkor)، مَرن چیری (Maran Cheri) اور پُتّانی میں حاصل کی۔ علاوہ عربی وملایالم کے اردو، فارسی اور ٹامل زبانوں میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ برطانوی حکومت نے ان کو اکسائز انسپکٹر (Excise Inspector) کا عہدہ عطا کیا۔

اِس زمانہ میں عیسائی مشنری ادارے بہت پُر نشاط تھے۔ انہوں نے بہت سے مناظرے کیے۔ اسلام پر اعتراضات کیے، کتابیں لکھیں اور پمفلٹ شائع کیے، آنحضرت ﷺ پر اعتراضات کیے۔ انھوں نے ایک پندرہ روزہ اخبار 'تحفۃ الاخیار وہدایۃ الاشرار' کے نام سے نکالا جس میں علماء سوء پر تنقید ہوئی تھی، مگر اسے بند کرنا پڑا۔ اس سے قبل وہ ایک ہفتہ وار 'اسام مشتاپر کاشم' کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے، مگر وہ بھی جلد بند ہوگیا۔

بہر حال جب سے انہوں نے حکومت کی ملازمت ترک کی اپنا پورا وقت اسلام کی

خدمت اور انگریزوں کی مخالفت میں صرف کیا اور عیسائیوں کے مقابلہ میں ملایالم میں کتابیں لکھیں۔ انہوں نے ایک طرف تصوف کی مخالفت کی جس میں صوفی شیوخ عوام کو بے وقوف بناتے تھے اور کہتے تھے کہ جس کا کوئی شیخ نہیں ہوتا اس کا شیخ شیطان ہوتا ہے۔ دوسری طرف انہوں نے کینانور کو لینا ہاؤس اور ٹلیچری کے مسلمانوں کی اس رسم پر کُھل کر حملہ کیا کہ جائیداد صرف لڑکی کو دی جاتی ہے اور لڑکا اپنے والد کی جائیداد سے کچھ نہیں پاتا۔ وراثت کے اسلامی قانون سے گریز کر کے یہ اپنے آبائی غیر مسلم قانون کی پیروی ہے۔ انہوں نے اولیاء کی سفارش کے تصور پر بھی ضرب لگائی جس کے باعث ایک بار کینانور میں دوران تقریر ان پر حملہ کر دیا گیا۔

سید ثناء اللہ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے عربی، ملایالم کے خط کی اصلاح کی۔ انہوں نے جو اپنا پندرہ روزہ نکالا اس میں بھی اپنا اصلاح شدہ خط اور علامتیں استعمال کیں۔

علماء یہ تصور رکھتے تھے کہ ملایالم اور انگریزی کافروں کی زبانیں ہیں۔ ان کا مقاطعہ کرنا چاہئے، مگر انہوں نے وضاحت سے بتایا کہ زبان تمام انسانوں کی ملکیت ہے۔ مسلمانوں کو ملایالم میں لکھنا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ علماء کا فرض ہے کہ وہ ملایالم میں قابلیت پیدا کر کے عوام کی اصلاح کا فرض انجام دیں۔

اس سلسلہ میں انہوں نے علماء کی اصلاح کی کوشش بھی کی۔ انہوں نے عربی مدرسوں میں بلیک بورڈ کے استعمال کا رواج ڈالا۔ ان کے علمی کاموں کا بڑا حصہ عیسائیوں کے اعتراضات کے جواب میں ہے۔ انہوں نے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی مشہور کتاب 'اظہار الحق' کو اپنا مرجع بنا کر عیسائیوں کو دندان شکن جواب دیا۔

انھوں نے عیسائیوں کے خلاف تقریریں شروع کیں۔ انہوں نے ان کے اعتراضات کے جواب دئے۔ بائبل سے کثرت سے اقتباسات پیش کئے اور ان کے نظریات کا رد کیا اور خود ان پر اعتراضات وارد کئے۔ سب سے پہلا کام تو انہوں نے یہ کیا کہ برطانوی حکومت کی ملازمت سے ۱۸۸۲ء میں استعفی دے دیا۔ اور پھر ڈٹ کر عیسائیوں

کے مقابلہ میں آئے۔ پادریوں کے مقابلہ میں کتابیں لکھیں۔ پمفلٹ شائع کیے۔ ۱۸۸۴ء میں انہوں نے عیسائیوں کے خلاف ایک بہت ہی کامیاب مناظرانہ کتاب تصنیف کی جس کا نام تھا Katakura kuthdram۔ اس میں انہوں نے تین خدا اور تثلیث کے تصور پر اعتراضات کئے۔ پھر انہوں نے ۱۸۹۲ء میں ایک دوسری کتاب لکھی جس میں یہ ثابت کیا کہ انجیل کی رو سے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ ہیں۔ انہوں نے چیلنج کیا کہ ان کی دلیلوں کو کوئی بھی عیسائی رد کرے، مگر کسی نے ان کی کتاب کا جواب نہیں لکھا۔ انہوں نے پریس قائم کرنے کی کوشش کی، تاکہ اپنی کتابیں شائع کرسکیں۔ کئی رسالے نکالے، مگر وہ چل نہ سکے۔ ایک ماہنامہ Paropkar کے نام سے نکالا۔ یہ تین برس چلا، مگر وہ اس میں اتنے مقروض ہوگئے کہ اپنی جائیداد اور گھر بیچ کر اس کا قرضہ ادا کیا۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری (Mobi Nanayam) لکھی۔

ان کی ملایالم تصانیف کی پوری فہرست تو میسر نہیں۔ بعض مسوّدے شائع نہ ہوسکے اور ضائع ہوگئے۔ یہاں ان کی عربی اور ملایالم میں لکھی ہوئی کتابوں کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے۔

(1) Talim Ul- Ikhwan

(2) Mualim Ul- Ikhwan

(3) Marumakka Ttayam

(4) Katakurakuthdram

(5) Kristiya Ainevijayam Porkalam

(6) Kristiya Vayarappu

(7) Kathoravaj Ram

(8) Nabi Monayam

(9) La Muajud La- point.

سید ثناء اللہ کا انتقال کوچین میں ۱۸/ستمبر ۱۹۱۲ء کو ہوا۔ انہوں نے انگریزوں،

عیسائیوں اور پادریوں کی مخالفت کی ۔ وہ پہلے مسلم مذہبی عالم ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کیا۔انہوں نے مدرسوں کی اصلاح کی ۔قدامت پسند علماء کے برعکس وہ قرآن مجید کا ترجمہ اردو میں کرنا چاہتے تھے ۔ وہ ماپلاّ جماعت میں سوشل رفارمر کی حیثیت سے اولیت کا درجہ رکھتے ہیں ۔تعلیم ،تصنیف اورادارت میں ان کی سبقت نے درحقیقت ان اصلاحی کاموں کے لئے راہ ہموار کردی جو بعد میں مسلمانوں نے بڑی تعداد میں عربی اور انگریزی کالج قائم کرکے انجام دئے ۔

چالیلا کٹ کنہ احمد حاجی(Chalilakatt Kunhammad Haji)

حاجی کن حمّد (کنہی احمد) انیسویں صدی عیسوی کے ایک بڑے مصلح گزرے ہیں ۔انہوں نے کیرالا میں مدارس عربیہ کی اصلاح میں ایک بنیادی رول ادا کیا ہے ۔انہوں نے مدارس کو جدید طریقوں اور مغربی انداز پر ترقی دینے کی کوشش کی ۔اس دور میں دقیانوسی علماء اخبار پڑھنے سے بھی لوگوں کو روکتے تھے کہ لغو کام ہے اور ''لھوالحدیث'' میں آتا ہے،مگر کُن حمّد حاجی نے اپنے طلباء کو شوق دلایا کہ وہ اخبار پڑھیں اور زندگی اور اس کے مسائل سے ،جن میں وہ رہتے ہیں، واقفیت حاصل کریں ۔اس زمانہ میں لڑکیوں کی تعلیم بالکل ممنوع تھی ۔اس وقت بطور عملی نمونہ کے خود انہوں نے اپنی لڑکیوں کو اسکول بھیجا اور جدید تعلیم دلائی،انہوں نے جدید تعلیم کی وکالت پرزور طریقے سے کی ۔

ان کے والد مُٹاٹ خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو تجارت پیشہ تھا اور تیرور کے پاس پون منٹم اُدرسری(Ponmuntam Adrssri) میں مقیم تھا۔ان کی ماں فاطمہ چلالیلا کات ابراہیم کی بیٹی تھیں،مگر جلد ہی انہوں نے وفات پائی اور ان کی پرورش ان کے چچاؤں نے کی ۔ پرائمری تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود سے محنت کرکے وہ علم و فضل کی اعلیٰ منزل تک پہونچے ۔ پھر بھی علم کی لذّت کشاں کشاں ان کو دارالعلوم لطفیہ لے گئی، جہاں سے انہوں نے سند فراغت حاصل کی ۔ یہاں انہوں نے مولانا عبدالجمال پیشاوری اور مولانا حسن رامپوری سے تعلیم حاصل کی ۔مولانا عبدالجبار جو بعد میں باقیات

الصالحات کے پرنسپل بنے اور مولانا عبدالعزیز صاحب جو خود دارالعلوم لطفیہ کے پرنسپل مقرر ہوئے، دونوں ان کے کلاس فیلو تھے۔ کنہ حمّد کچھ دن ترونگاری اور ماہی میں کام کرنے کے بعد دارالعلوم واڑ کاڑ منتقل ہوگئے اوراس کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ حاجی صاحب شہرت کی بلندی پر پہنچ گئے تھے، اس وجہ سے ہر طرف سے طلبہ نے اس مدرسہ کا رخ کیا۔ انہوں نے حدیث، فقہ، تفسیر کے علاوہ علم الحساب، جغرافیہ، منطق اور فلسفہ کی تعلیم کو رواج دیا۔ اس وقت کے ایم مولوی ان کے شاگرد تھے اوران کے مددگار بھی، خصوصاً مراسلت میں ان کی مدد کرتے تھے۔ حاجی صاحب نے کوشش کرکے پڑھانے میں نئے آلات کا استعمال کیا۔ اٹلس، نقشے اور مراجع کے لئے اعلیٰ قسم کی ایک لائبریری کی انتظامیہ نے بڑی خوشی سے منظوری دی اوراساتذہ کے لئے یہ تمام چیزیں فراہم کی گئیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ بہت سے طلبہ کی مادری زبان ملایالم ہے اورعلم الحساب میں وہ بہت کم زور ہیں، لہٰذاانہوں نے ان دونوں مضامین کونصاب میں داخل کرایا۔ نئے نصاب اور نئے مواد نے مدرسہ کونئی زندگی عطا کی۔ اس کی شہرت بڑھی، مگر قدامت پسند علماء نے ایک طوفان کھڑا کردیا کہ وقف کی آمدنی کا غلط استعمال ہورہا ہے اورگم راہ کن مضامین اور کتابیں داخلِ درس کی گئیں ہیں، اس پر پرنسپل کنہ حمّد حاجی صاحب نے علمائے جنوب کیرالا کا ایک کمیشن مقرر کیا جس نے آکر نصاب کی جانچ کی اوراس کو مستحسن قرار دیا جس سے دارالعلوم کی شہرت اور بڑھ گئی۔ اب انہوں نے واڑ کاڑ چھوڑ کر منارگھاٹ مدرسہ میں کام کرنے کوترجیح دی اور وہاں کے مدرسہ میں بھی وہی اصلاحات جاری کیں جو دارالعلوم واڑ کاڑ میں کی تھیں۔ وہ اس مشن میں منہمک تھے کہ ۶/صفر ۱۳۳۸ھ کو ۶۳ برس میں پیام اجل آپہونچا۔

بہرحال انہوں نے مدرسہ کی تعلیم کی تجدید واصلاح کی تحریک اٹھائی، اس کا نصاب بدلا، درس نظامیہ سے اس کو آزاد کیا، نیا نصاب بنایا، نئے مضامین کا نصاب میں اضافہ کیا، مادری زبان ملایالم کوتعلیم میں شامل کیا، خاص طور سے انہوں نے عربی، ملایالم کو ترقی دی اوران کے خط میں تبدیلیاں کرکے ان کومکمل اورترقی یافتہ بنایا۔ وہ اس دیار میں

مدرسہ تعلیم کے اہم مصلحین میں شمار کئے جاتے ہیں۔

شیخ محمد ہمدانی تھنگل م۱۹۲۲ء(Shaykh Mohd. Hamdani Tangal)

شیخ محمد ہمدانی تھنگل سابق ترانوکور اسٹیٹ میں ویکوم (Valkkom) تحصیل میں ایک مقام Vadutala واڈ وٹالا میں پیدا ہوئے ۔ پہلے انہوں نے کڈنگالور (Kodungallur) میں تعلیم حاصل کی، پھر مدرسہ لطفیہ ویلور سے فراغت حاصل کی۔ عربی، فارسی اور اردو زبانوں کی تحصیل کی اور تصوف میں ہمدانی طریقہ اختیار کیا۔ ویلور سے فراغت کے بعد وہ ویکوم واپس آ گئے اور ہمدانی طریقہ کی اشاعت کرنے لگے۔ انہوں نے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف توجہ دلائی اور سرسید احمد خاں کی تحریک ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخ یہاں بھی قائم کی اور نوجوانوں کو جمع کیا، تاکہ مسلمانوں میں تعلیم کا رواج بڑھے۔ انہوں نے عربی ملایالم کے ماہنامہ 'مسلم' میں کئی مقالے اس سلسلہ میں لکھے کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ حکومت ٹراونکور نے انہیں سری مولم پرجا سبھا کا رکن بنایا۔ انہوں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ ملایالم اور انگریزی کے ساتھ مسلمان بچوں کی عربی کی تعلیم کا بھی انتظام حکومت کو کرنا چاہیے۔

بعد میں وہ کوچین آ گئے اور اس کو اپنا سینٹر بنالیا۔ یہاں انہوں نے ایک مدرسہ مٹانچیری Mottanchery میں قائم کیا۔ کوچین میں عبدالرحمٰن بیسو سیٹھ نے ان کی بھرپور مدد کی۔ انہوں نے مہڈراپلّی میں اپنا مرکز قائم کیا اور تصوف کی اشاعت شروع کردی۔ اس سلسلہ میں ایک کتاب 'عرفانِ اسلام' کے نام سے تصنیف کی اور الوائی، الیّسی، ہری پاڈ اور ٹراونکور وغیرہ میں اپنا تبلیغی مشن پھیلا۔ انہوں نے توہم اور بدعت کے خلاف بھی تحریک چلائی۔ ہمدانی تھنگل اور ان کے شاگرد سید محمد تھنگل نے مل کر ایک ڈکشنری مرتب کی، جو عربی، سنسکرت اور ملایالم الفاظ پر مشتمل تھی۔ یہ ایک سہ لسانی مختصر قاموس تھا۔ ہمدانی ایک ملایالم رسالہ Swadesh Bhimani اور مسلم رسالہ میں مقالات لکھتے تھے جس کو ولّم عبدالقادر نکالتے تھے۔

جنگ بلقان کے زمانہ میں انہوں نے ترکوں کی مدد کے لئے ایک فنڈ قائم کیا۔ کے ایم سید تھی صاحب کی دعوت پر ہمدانی کوچین سے کوڈ نگالور منتقل ہوگئے۔انہوں نے لجنہ ہمدانی سبھا بہ مقام اری یاڈ Eriyad قائم کی۔ان علاقوں میں ان اداروں نے بڑی اصلاحی خدمت انجام دی اور کئی مدرسے یہاں قائم ہوئے۔ان میں ایک قصبہ اڑی کوڈ Azhikkod ہے۔ یہاں بھی انہوں نے تعلیمی اور اصلاحی کام انجام دئے۔سری راج گوپال آچاریہ نے حکومت ٹراونکور کی جانب سے الوائی میں ۷/ ایکڑ زمین دی، تاکہ علی گڑھ کالج کے طرز پر ایک کالج بنایا جائے۔مسلم ایکیا سنگھم (Muslim Aikya sangham) میں ہمدانی نے پر جوش تقریر اس موضوع پر کی، لیکن عملا کالج نہ بن سکا اور ان کا انتقال ۱۹۲۲ء میں وے ڈوتالا Vadutala میں ہوا۔

کے.ایم.مولوی (۱۸۸۶ء تا ۱۹۶۴ء)

کے.ایم.مولوی ایک جامع صفات انسان تھے۔انہوں نے تحریک آزادی میں زبردست حصہ لیا تھا۔انہوں نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی تھی۔وہ ایک بڑے عالم دین، فلسفہ داں، اسکالر اور مصلح تھے۔ٹائل محمد مولوی Tayyil Muhammad) (Maulvi ۶/ جولائی ۱۹۸۶ء میں مقام کک کاڈ (Kakkad) میں پیدا ہوئے جو ترورنگاڈی کے قریب ہے۔ان کے والدین تعلیم یافتہ تھے۔ پہلے ترورنگاڈی میں تعلیم حاصل کی، پھر دارالعلوم واڑکاڑ چلے گئے۔اس وقت اس کے پرنسپل سی.کنہ حمّد حاجی صاحب تھے۔انہوں نے اس طالب علم کا دارالعلوم سے فراغت کے بعد وہیں استاذ کی حیثیت سے تقرر کردیا۔کے.ایم.مولوی نے اپنے استاذ حاجی صاحب کے نقش قدم پر اصلاح تعلیم میں حصہ لیا اور اس مشن کو آگے بڑھایا۔

اسی کے ساتھ کے.محمد مولوی صاحب نے اس علاقہ میں سب سے پہلے تحریک خلافت سے اپنا تعلق پیدا کیا اور اگست ۱۹۲۰ء میں وہ اس کے ممبر بن گئے۔ مالابار میں وہ خلافت کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔انہوں نے پورے کیرالا کا دورہ کیا اور خلافت

کے پیغام اور انگریزوں کے خلاف جدوجہد کو عام کیا۔ انھوں نے ہندوستانیوں کے جذبات کو حکومت برطانیہ کے خلاف ابھارا۔ مختلف کانفرنسوں اور جلسوں کو خطاب کیا اور پورے مالابار کو اپنی تقریروں اور سرگرمیوں سے ایک شعلہ جوالا بنا دیا۔ کنڈوٹی کانفرنس جو نومبر ۱۹۲۰ء میں منعقد ہوئی، اس میں کے. محمد مولوی صاحب بیمار تھے، مگر لوگ ان کو ہاتھوں میں اٹھا کر لائے۔ پھر دوسری خلافت کانفرنس ۱۵/ جنوری ۱۹۲۱ء کو کالی کٹ میں منعقد ہوئی۔ اس جلسہ میں مولوی صاحب نے ہندو مسلم اتحاد پر تقریر فرمائی۔ حکومت نے ان پر کڑی نگرانی شروع کر دی۔ ایروڈ (Erode) میں ہندوستانی مجلس العلماء کا جلسہ ہوا۔ مولوی صاحب نے اس جلسہ میں شرکت فرمائی۔ واپسی میں خود کیرالا میں اس کی شاخ قائم کی۔ اس میں مجلس علماء نے پمفلٹ شائع کیے، خلافت کے پیام کو عام کیا اور پورے کیرالا میں خلافت نے ایک فضا قائم کر دی۔ انگریزوں کے خلاف جذبات اور حصولِ آزادی کی آرزوئیں دلوں میں ابھرنے لگیں۔

خلافت کا جو اجلاس اٹالیم میں ۲۲ تا ۲۶/ اپریل.....کو منعقد ہوا، کے. محمد مولوی نے اس میں بنیادی رول ادا کیا۔ کے. سی. کیوٹمنین اور کے. ایم. مولوی صاحب دونوں نے جذبات کی نزاکت کا خیال کر کے عوام الناس اور پولس میں آویزش کو روکا۔ یہ اجلاس مختلف حیثیتوں سے ہندو مسلم اتحاد کا اعلیٰ نمونہ تھا، اس میں ہندو مسلم زعمائے آزادی نے بڑے شوق سے شرکت کی۔ دراصل حکومت علی مصلیار کو گرفتار کرنا چاہتی تھی جو خلافت تحریک کے اصل روح رواں تھے۔ پولس نے ترورنغاڑی میں خلافت کے کارندوں کو گرفتار کر لیا، مگر غضب یہ ہوا کہ حکومت نے فوج کی ایک ٹکڑی بھیج دی جس کے آنے سے ماپلاّ مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے۔ ان فوجیوں نے خلافت کا جھنڈا پھاڑ ڈالا، آفس لوٹ لیا، فرنیچر توڑ ڈالا۔ پھر بھی کے. ایم. مولوی صاحب نے ماپلاّ وں کے جذبات کو مشتعل ہونے نہ دیا اور پوری کوشش کی کہ حالات کو قابو میں رکھیں۔ جن لوگوں کو پولس نے گرفتار کر لیا تھا ان کو چھڑانے کے لئے ایک جماعت کلکٹر سے ملنے گئی۔ اس پر حکومت نے گولیاں چلا دیں۔ ادھر غضب یہ ہوا کہ فوج نے مسجد میں گھس کر علی مصلیار اور ان کے

ساتھیوں کو گرفتار کرلیا۔ اس کے نتیجے میں ترورنگاڑی اور ارناڈ میں فساد پھیل گیا۔ بغاوت رونما ہوئی اور ماپلاّ مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا۔ ۱۹۲۱ء کی اس تحریک آزادی میں ماپلاّ ؤں نے برطانوی حکومت کی پوری مشنری کو ۶ ماہ تک معطل کردیا۔ بالآخر فوج نے اس پر قابو پایا۔ ۱۰ ہزار سے ۲۲ ہزار تک مسلمان شہید ہوئے۔ بہرحال اس آزادی کی جنگ میں کے .ایم .مولوی کے خلاف بھی الزامات تھے، مگر وہ وہاں سے بچ کر کوچین راجا کی حکومت میں پہونچ گئے، جہاں ان کے طاقتور اور بااثر دوستوں نے آئندہ گیارہ برس تک ان کی حفاظت کی اور ان کو گرفتار نہیں ہونے دیا۔ وہ درحقیقت ایک علاقہ اڑی کوڑ Azhikkod میں مقیم ہوگئے تھے جو کوچین اور ٹرپچور کے درمیان ہے۔ کے .ایم سیفی اور ایم .منا باڈکنہ حمد حاجی ان کے ساتھی بن گئے۔ انہوں نے اپنی اصلاحی سرگرمیوں میں ایک اور رفیق پالیا، یعنی ویکوم عبدالقادر مولوی جو ٹراونکور کی ریاست میں ایک بڑے مصلح تھے۔ ان دونوں نے مل کر بڑے بڑے اصلاحی کارنامے مسلمانوں کی سوشل لائف میں انجام دئے۔ جب کے .ایم .مولوی صاحب نے اڑی کوڑ میں رہائش اختیار کی تو اس علاقہ کے مسلمان گو مال دار اور تعلیم یافتہ تھے لیکن وہ دو گروہوں میں منقسم تھے۔ پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ ان دونوں گروہوں میں صلح کرائی، اس کے بعد انہوں نے مسلمانوں میں اتحاد کے لئے ایک مجلس بنائی جس کا نام Muslim Aikyam Sangham رکھا، پھر اس اتحاد کے زیر اثر دو رسالے جاری کئے۔ ایک ملایالم میں Muslim Aikyam کے نام سے اور دوسرا عربی ملایالم میں Al-Irshod۔ ان علماء نے بدعات کے خلاف آواز اٹھائی۔ سنگھم کا پہلا سالانہ اجلاس اڑی کوڑی ویکم عبدالقادر مولوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ دوسرا سالانہ اجلاس ویلور عربک کالج کے پرنسپل کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ علمائے کیرالا کا ایک اجلاس الگ سے منعقد ہوا اور اس اجلاس کی بنیاد پر کیرالا جمعیۃ العلماء کی تاسیس ہوئی۔ کے .ایم .مولوی صاحب نے حج بھی کیا۔ اس موقع پر انھوں نے سلطان ابن سعود کی خدمت میں حاجیوں کی سہولت کے لئے چند تجاویز پیش کیں، جن کو انہوں نے شرف قبولیت سے نوازا۔ اس کے بعد وہ ہندوستان واپس آئے۔ یہاں انہوں نے سنگھم کا

دسواں اجلاس بی. پوکر صاحب کی زیر صدارت اری یاڈ Eriyad میں منعقد کیا۔ یہ ایک زبردست اجلاس تھا۔ اس کے معاً بعد یہ خبر پھیل گئی کہ مدراس حکومت نے مولوی صاحب کی گرفتاری کا وارنٹ واپس لے لیا اور اب وہ آزاد ہیں۔

کے. محمد مولوی صاحب مالا بار آئے اور ترورنگاڑی میں قیام فرمایا تو پہلا کام یہ کیا کہ وہاں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ نورالاسلام مدرسہ انہوں نے ۱۹۴۳ء میں قائم کیا۔ اس سال اس علاقہ میں کالرازوروں سے پھیلا، ہزاروں انسان اس کی وجہ سے لقمۂ اجل بن گئے۔ مولوی صاحب نے یتامی کے لئے ایک یتیم خانہ دسمبر ۱۹۴۳ء میں ترورنگاڑی میں قائم کردیا۔ شروع میں اس میں صرف ۱۴ لڑکے تھے۔ اب اس کا نام پوکر صاحب میموریل یتیم خانہ ہے۔ اس میں ایک ہزار یتامی ہیں جن میں ۳۰۰ کے قریب لڑکیاں بھی ہیں۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے الگ الگ ہوسٹل ہیں۔ یتامی کی تعلیم کے لئے اورینٹل ہائی اسکول قائم کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۵ء میں ایک ٹریننگ اسکول بھی قائم کیا گیا۔ یتامی کے لئے جس کا تعلق ہائی اسکول سے ہے ۱۹۶۸ء میں ایک فرسٹ گریڈ کالج پی، ایس، ایم، او (P.S.M.O.) بھی قائم کیا گیا۔

الغرض ان کی زندگی میں تعلیم کا فروغ اور اصلاح عقائد کو بنیادی اہمیت حاصل رہی، مگر یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ ایک بڑے مجاہد آزادی ہیں۔ انہوں نے انگریزوں کی مخالفت میں بڑے بڑے معرکے سر کیے اور خود کو گرفتار بھی نہیں ہونے دیا۔ وہ برابر سرگرم عمل رہے۔

کے. ایم مولوی صاحب نے عورتوں کی تعلیم پر زور دیا۔ اس وقت کے قدیم علماء عورتوں کی تعلیم کو گناہ تصور کرتے تھے۔ انہوں نے مدرسے میں بھی اور یتیم خانہ میں بھی لڑکیوں کو داخلہ دیا اور لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو جدید تعلیم دینے کی کوشش کرتے رہے۔

مولوی صاحب کی ایک تمنا یہ بھی تھی کہ قرآن مجید کو عربی سے اردو میں ترجمہ کیا جائے، اس کے لیے انھوں نے اسلامک لٹریچر سوسائٹی (Islamic Literature

(Society قائم کی ۔ کالی کٹ میں ۱۹۳۴ء میں اس کے ماتحت ابتدائی دو جلدیں ترجمۂ قرآن کی چھپیں، پھر یہ کام رک گیا۔ یہ کام انہوں نے خود اپنی نگرانی میں کرایا تھا۔ انہوں نے اسلامی لٹریچر کی اشاعت کے لئے پہلے بھی رسالے نکالے تھے۔ اب ترورنگاڑی سے عربی ملایالم جاری کیا۔ اس کے علاوہ دوسرا رسالہ المنار تھا جس میں ان کے فتاوی المرشد اور ارشادات شائع ہوتے تھے۔ کے.ایم.مولوی صاحب کا انتقال ۱۰/ستمبر ۱۹۶۴ء میں کالی کٹ میں ہوا اور تدفین ترورنگاڑی میں ہوئی۔

وکّم عبدالقادر مولوی Vakkam Abdul Qadir Maulvi (۱۸۷۳ء-۱۹۲۳ء)

عبدالقادر مولوی مسلمانوں کے مصلحین میں اس علاقہ مالابار میں نہایت اہم شخصیت کے حامل ہیں۔ وہ وکّم Vakkam میں پیدا ہوئے۔ کیرالہ میں یہ بھی رواج ہے کہ اپنے نام کے ساتھ آدمی اپنے آبائی گھر کا نام لگالیتا ہے، یا پھر اس گاؤں، شہر یا قصبہ کا نام جس میں وہ پیدا ہوا ہے۔ یہ طریقہ میں نے نائیجریا میں بھی دیکھا ہے کہ لوگ اپنے نام کے ساتھ اپنے وطن کا نام لگالیتے ہیں اور وہ ان کے نام کا ایک جزء لاینفک ہوجاتا ہے۔ وکّم اس لحاظ سے مولوی عبدالقادر صاحب کے نام کا جز ہے۔

وکّم مولوی صاحب نے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دیا کہ مسلمانوں کی معاشرتی اور مذہبی زندگی سے بدعات کا خاتمہ ہو۔ اس راہ میں انہوں نے عظیم جدوجہد کی اور اپنی خالص اسلامی تحریک کو رواج دینے کے لیے رسالے نکالے۔ انہوں نے 'دی مسلم' ملایالم میں شائع کیا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں دیپک نکالا، اس میں قرآن مجید کا ملایالم ترجمہ چھپتا تھا۔ تفسیر وتشریح بھی وہ لکھتے تھے۔ اس میں ایک موضوع عالم اسلام کی خبریں ہوتا تھا۔ یہ موضوع بالکل نیا تھا۔ اس کے چند شمارے مولوی صاحب نے نکالے، اس کے بعد پریشانیوں کے باعث رسالہ کو بند کرنا پڑا۔

کے . ایم . مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ تراونکور میں مسلمانوں کی تعداد ۱۹،۰۵،۶۹۷ ہے۔ وہ آبادی کا اعشاریہ ۶ فیصدی ہیں۔ مگر ایک ہزار میں صرف ۸۴ تعلیم

یافتہ ہیں ۔۲۰ سال کی عمر والی لڑکیوں میں ۱۰۰ میں صرف ایک لڑکی تعلیم یافتہ ہے ۔ یہ امر سارے مسلمانوں کے لئے باعث تکلیف ہے ۔ پھر جو مسلمان مختلف پیشوں میں مصروف ہیں، عدم تعلیم کے باعث ان پیشوں کو اعلیٰ اور جدید وسائل استعمال کر کے آگے بڑھا نہیں پاتے ۔ اصل مرض مسلمانوں میں جدید تعلیم کا فقدان ہے ۔ چنانچہ مسلمانوں کو تعلیم پر ابھارنے کے لئے انہوں نے کئی ماہنامے نکالے ۔

مضامین اور رسالوں کے علاوہ انہوں نے عملی طور پر تعلیم کی ترقی کے لیے مسلمانوں کی ایک کانفرنس منعقد کی ۔ اس میں غور وخوض کے بعد مندرجہ ذیل تجاویز پاس ہوئیں :۔

(۱) اسکولوں میں عربی پڑھانے کے لئے عربی ٹیچر کا تقرر کیا جائے ۔
(۲) دو عربی انسپکٹر مقرر کیے جائیں تا کہ وہ عربی تعلیم کا جائزہ لیں ۔
(۳) مسلمان طلبہ کو دسویں کلاس سے اسکالرشپ دی جائیں ۔
(۴) مسلم اسکولوں کو پوری گرانٹ دی جائے ۔

یہ تجاویز ریاستی حکومت کو پیش کی گئیں اور رفتہ رفتہ ساری تجاویز عملی صورت میں منظور ہوئیں ۔ کے .ایم .مولوی صاحب نے یہ تجویز بھی رکھی کہ مقامی کمیٹیاں بنائی جائیں جو والدین کو اسکول بھیجنے پر آمادہ کریں ۔ کے .ایم .مولوی صاحب نے 'دی مسلم' (The Muslim) میں ڈویژنل انسپکٹر آف اسکولس او .اتم .چیرن کا ایک مقالہ شائع کیا جس میں انہوں نے بتایا تھا کہ ایک ضلع میں ۱۰ تحصیلیں ہیں ۔۱۰ ۔۲۰ کی عمر والی مسلمان لڑکیوں کی تعداد ۸۵۸۹ ہے، مگر تعلیم یافتہ صرف ۸۱۳ ہیں ۔ اسی طرح انہوں نے لکھا کہ کولیون شمبر میں ۱۰ – ۱۵ سال کی درمیانی عمر کے ۴۶۴۲ مسلمان ہیں، مگر تعلیم یافتہ صرف سولہ ہیں ۔ کے .ایم .مولوی صاحب کی جدوجہد سے کاپلّی اور کرونا گایلی میں لڑکیوں کے اسکول شروع کیے گئے ۔ ڈائریکٹر آف پبلک انسپکٹرس نے ایک تقریر میں کہا کہ کے .ایم .مولوی صاحب اور ان کے رسالہ 'دی مسلم' نے مسلم ایجوکیشن کے میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ حکومت کی خدمت سے بھی زیادہ ہیں ۔ گورنمنٹ اتنا عمدہ

کام مسلمانوں کی تعلیم کی ترقی میں اس بنا پر انجام دے سکی کہ مولوی صاحب کی مدد، مشورہ اور جدوجہد اس کے ساتھ تھی۔

کے.ایم.مولوی صاحب نے جو تعلیم کی آواز اٹھائی اس پر الپّی شہر میں الجنة المحمدية قائم ہوئی۔اس نے ایک پرائمری اسکول قائم کیا اور اس میں عربی کی تعلیم کا بھی انتظام کیا۔ جب حکومت نے عربی اساتذہ کو مقرر کرنے کا اعلان کیا تو کے.ایم.مولوی نے جانچ کر عمدہ اساتذہ کا انتخاب کیا اور خود نصاب کی کتابیں تیار کیں۔ان کی کوششوں سے یہ تعلیمی منصوبہ کامیاب ہوا اور یہ حقیقت ہے کہ آج مسلمان کیرالا کے جنوب میں زیادہ تعلیم یافتہ ہیں بمقابلہ کیرالا کے شمال یعنی مالابار کے۔مسلمانوں کی تعلیمی مدد اور دوسرے اسلامی فرائض کی ادائیگی کے خیال سے ایک مسلم ہوسٹل تریونڈ رام میں کنوکوڑی (Kunndkyzhi) میں قائم کیا گیا۔ یہ دراصل مولوی صاحب ہی کی تجویز تھی۔انہوں نے بہت پہلے 'دی مسلم' میں ۱۴/مئی ۱۹۱۹ء کو یہ تجویز رکھی تھی۔ جب کبھی وہ ٹریونڈرم آتے ،ہوسٹل کی زیارت ضرور کرتے۔

انہوں نے حکومت کے اندر مختلف برائیوں کے خلاف اپنے رسالہ سوادیش ابھامانی (Swadesh Abhimani) میں مارچ ۱۹۹۱ء کو اعلان کیا کہ ہم لوگوں کی شکایتیں اس رسالے میں واضح کریں گے،حکومت سے ہرگز نہ ڈریں گے اور وہ برائیاں، رشوتیں اور دوسرے عیوب طشت از بام کریں گے جو حکومت کے آفیسروں میں عام ہیں۔ مولوی صاحب نے ایک نیا کام یہ کیا کہ اس کا ایڈیٹر رام کرشنا پلّائی کو مقرر کیا جنہوں نے کھل کر دیوان (وزیراعظم) پر تنقید کی۔نتیجۃً وہ اس رسالہ کا دشمن بن گیا۔رام کرشنا پلّائی نے حکومت کے راجا پر اور دیوان پر نہایت کڑی تنقیدیں اپنے اداریے میں لکھیں۔ کے .ایم.مولوی صاحب کو وارننگ دی گئی، سمجھایا گیا، مگر انہوں نے اپنا موقف نہ بدلا۔ بالآخر ۲/ستمبر ۱۹۱۵ء کو دیوان صاحب نے راجا کے حکم سے پریس ضبط کرلیا اور کرشنا پلّائی کو ریاست سے باہر نکال دیا۔ جب لوگوں نے یہ شکایت کی کہ ان کا پریس ضبط ہوا، مالی نقصان ہوا، رام کرشنا پلّائی نے تنقیدوں کے ذریعہ نقصان پہونچایا تب مولوی صاحب

نے کھل کر پلاّئی کی تعریف کی اور فرمایا کہ انہوں نے حکومت ، رعایا اور عام لوگوں کی خیر خواہی کے لیے مقالات اور اداریے لکھے اور حق باتیں پیش کیں ۔ اصل نقصان ریاست سے ان کے جانے کا ہے، نقصان اور کچھ نہیں ہوا۔

ہر چند کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کے مسائل میں شب و روز منہمک تھے اور اس راہ میں انہوں نے اپنی زندگی کی قربانی دینے کا عہد کر لیا تھا جس پر وہ آخر تک قائم رہے، مگر ان کی ہمدردیاں کانگریس کے ساتھ تھیں اور اس کی بنا پر اپنے لڑکے عبد السلام کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے جامعہ ملّیہ روانہ کیا جو کہ حکومت سے تسلیم شدہ ادارہ نہ تھا اور اس کی ڈگری سے ملازمت نہیں ملتی تھی۔ یہ قربانی وہی دے گا جس کے دل میں قومی تحریک سے ہمدردی اور محبت ہوگی اور انگریزوں سے نفرت ۔ الغرض کے .ایم .مولوی نے تعلیمی نشاط و مسرت سے پُر زندگی گزاری اور مینار بن کر علم کی شمع جلاتے اور روشنی پھیلاتے رہے۔ ۱۹۳۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔

مراجع و مآخذ

اس مقالہ کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

۱- ملایالم ذخیرۂ الفاظ اور گرامر پر عربی کے اثرات، (مقالہ برائے پی ایچ ڈی) پروفیسر پی پی عبدالرحمٰن، مخطوطہ کالی کٹ یونیورسٹی، کیرالا (انگریزی میں)

۲- ماپلا مسلمس آف مالابار، کے، ای، ملّر (MILLER) مدراس، ۱۹۷۶ء

۳- اے مینول آف مالابار، لوگن (Logan)

۴- ماپلا مسلمس آف کیرالا، اے پی ابراہیم کنجو

۵- مخادیم مالابار (مقالہ برائے ایم فل) مخطوطہ کالی کٹ یونیورسٹی، عبدالرحیم

☆

ترجمہ وتلخیص

بیویوں کے درمیان عدل کے ضوابط

ڈاکٹر محمد بن ناصر الحمید

مترجم: مفتی مجاہد شبیر احمد فلاحی قاسمی

اسلام نے عورت کے ساتھ فضل وعنایت کا معاملہ کیا ہے۔عہد جاہلیت میں وہ ذلت وپستی کی زندگی گذار رہی تھی،اس کے تمام حقوق پامال ہورہے تھے۔اسلام نے اسے تحفّظ فراہم کیا،اس کے حقوق کی رعایت کی،اس کی تربیت اور دیکھ بھال کی ترغیب دی،اس پرخرچ کرنے پراُبھارااوراس کام پراجرِعظیم کی بشارت دی۔

اسلام نے عورت کوشوہر کے انتخاب کا حق دیا۔چنانچہ اس کواس شخص کے ساتھ شادی پرمجبورنہیں کیاجاسکتا جس کووہ پسند نہ کرتی ہو،اس کی شادی اس کی مرضی کے بغیرنہیں کی جاسکتی۔شادی کے بعداسلام نے شوہر پر بیوی کے اور بیوی پرشوہر کے حقوق متعین کیے۔ چنانچہ اس نے شوہر پرلازم کیاہے کہ وہ بیوی کا نفقہ اٹھائے اوراس کے ساتھ اچھابرتاؤ کرے۔ پھرعورت جب ماں بن جاتی ہےتو وہ مزیداعزاز واحترام کی مستحق ہوجاتی ہے۔اسلام نے اولاد پرلازم کیاہے کہ وہ حتی الامکان ماں کے ساتھ نیکی اوراحسان کابرتاؤ کرے۔

اسلام عورت کی عزت وناموس کی حفاظت کرتا ہےاوراس کے جسم،عزت وآبرویا مال میں کسی طرح کی حق تلفی کوحرام قراردیتا ہے۔وہ اس کواپنے مال میں تصرف کاحق دیتا ہے۔

اسلام کے عدل وانصاف کا ایک مظہر یہ ہے کہ اس نے ثواب وعقاب کے معاملے میں مرداورعورت کوبرابرکادرجہ دیاہے۔اللہ تعالی کاارشاد ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ (النحل:۹۷)

جوشخص بھی نیک عمل کرے گا،خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہووہ مومن،اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں)ایسے لوگوں کو اُن کے اجر اُن کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔

اسلام میں حقوق نسواں کی حفاظت ہی کا ایک مظہر یہ ہے کہ اس نے مرد کے لیے ایک سے زائد (چار تک) بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے۔اس لئے کہ اسلام مصلحت عامہ کو مصلحت خاصہ پر مقدّم رکھتا ہے۔مصلحت عامہ ہی کی وجہ سے تعدد ازواج کو جائز قرار دیا گیا ہے۔اس کے بہت سے اسباب وعوامل ہیں،مثلاً کبھی عورتوں کی کثرت اور مردوں کی قلت ہو جائے،تو اگر ایک مرد کو صرف ایک ہی عورت کے ساتھ شادی پر مجبور کیا جائے تو بہت سی عورتیں غیر شادی شدہ رہ جائیں گی۔اسی طرح بسا اوقات ایک مرد کے لیے ایک عورت کافی نہیں ہوتی،تو اگر اسے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت نہ دی جائے تو اس کے بدکاری میں مبتلا ہونے کا اندیشہ رہے گا۔اگر تعدد ازواج کو جائز قرار نہ دیا گیا ہوتا،تو وہی صورت حال ہوتی جو مغربی ممالک میں دیکھنے کو ملتی ہے کہ وہاں زنا سے پیدا ہونے والے ناجائز بچوں کی کثرت ہے۔عورت ایسے بچے کی پرورش کرنے پر مجبور ہے جس کے بارے میں وہ نہیں جانتی کہ اس کا باپ کون ہے۔؟اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے عورت کے حقوق کی کتنی رعایت رکھی ہے۔

تعدد ازواج کی صورت میں قرآنی احکام:

تعدد ازواج کے مسئلہ پر قرآن کریم میں واضح احکام آئے ہیں۔سورۂ نساء میں ہے:

... فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (آیت:۳)

...تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کرلو،لیکن اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو۔

اس آیت میں صراحت ہے کہ آدمی ایک سے زیادہ شادیاں کرنے پر اس وقت آمادہ ہو جب اپنے اندر بیویوں کے درمیان عدل کرنے کی ہمت پاتا ہو۔ اگر ایسا نہ کر پانے کا اندیشہ ہو تو صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے۔

اسی سورت میں آگے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. (آیت:۱۲۹)

بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمھارے بس میں نہیں ہے، تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے، لہٰذا (قانون الٰہی کا منشا پورا کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ) ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو اُدھر لٹکتا چھوڑ دو۔ اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اگر کسی شخص کی کئی بیویاں ہوں تو وہ ان کے درمیان پورا پورا عدل نہیں کر سکتا، خواہ اس کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر لے۔ اس لیے کہ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جن پر انسان کو قدرت نہیں ہوتی۔ مثلاً محبت اور میلانِ قلب، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں شوہروں پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ لیکن ساتھ ہی اس نے انھیں اس بات کی یاد دہانی کرا دی ہے کہ ان کے لیے یہ بات کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے کہ ان کا کلی میلان ایک ہی بیوی کی طرف ہو جائے اور دوسری بیوی معلّق ہو کر رہ جائے، کہ نہ شوہر والی معلوم ہو اور اپنے حقوق سے بہرہ ور ہو اور نہ وہ مطلّقہ ہو کہ اس کے لیے دوسرے مرد سے نکاح ممکن ہو۔ آیت کریمہ کا خاتمہ شوہروں کے لیے اصلاح اور تقویٰ کی وصیّت پر ہوا ہے، تاکہ بیویوں کے جو حقوق ان پر واجب ہیں اور ان کی ادائیگی پر وہ قادر ہیں، اس میں کوتاہی نہ کریں۔

یہ وصیّت ترغیب کے اسلوب میں آئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اگر تم حتّی الامکان

انصاف سے کام لینے کی کوشش کروگے تو جو تھوڑی بہت کوتاہیاں تم سے انصاف کے معاملے میں صادر ہوں گی انہیں اللہ معاف فرمائے گا۔

ان آیات سے جن مسائل کا استنباط ہوتا ہے انھیں آئندہ سطور میں بیان کیا جارہا ہے:

بیویوں کے درمیان عدل کا وجوب

اللہ تعالی نے اس شخص پر، جس کی ایک سے زائد بیویاں ہوں، ان کے درمیان عدل واجب قرار دیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

من کانت لہ امرأتان فمال الی احداھما جاء یوم القیامۃ و شقہ مائل۔ [1]

جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور پھر ان میں سے ایک کی طرف وہ زیادہ مائل ہو، تو قیامت کے دن وہ اس حال میں آئے گا کہ اس کا ایک کندھا جھکا ہوا ہوگا۔

حدیث میں دو بیویوں کا تذکرہ ہے، یہ کم سے کم تعداد ہے۔ یعنی اگر کسی کی تین یا چار بیویاں ہوں تو وہاں بھی یہی حکم ہے۔

بیویوں کے درمیان عدل کرنا لازم اور ضروری ہے، یہاں تک کہ مریض کے لئے بھی۔ اگر شوہر کا مرض بڑھ جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ باقی ایام کسی ایک بیوی کے پاس گذارنے کے لئے دیگر بیویوں سے اجازت لے۔ اگر وہ اجازت نہ دیں تو ان کے درمیان قرعہ اندازی کرے، ورنہ ان سب سے الگ رہے۔

سنت سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا مرض جب شدت اختیار کر گیا تو آپ نے دیگر ازوج مطہرات سے حضرت عائشہؓ کے ہاں رہنے کی اجازت چاہی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہے کہ جب آپ کی بیماری اور تکلیف بڑھ گئی تو آپ نے اپنی ازواج مطہرات سے اجازت طلب کی کہ ان کی تیمارداری میرے گھر میں ہو، انہوں نے اجازت دے دی۔ [2]

شوہر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی بیویوں میں سے ہر ایک کے ساتھ عدل کرے، خواہ وہ حیض ونفاس میں مبتلا ہو، یا احرام باندھے ہوئے ہو، یا اس کے ساتھ ظہار یا ایلاء کیا ہو۔[۳] ان تمام حقوق میں مسلمہ اور کتابیہ برابر ہیں۔[۴]

وہ امور جن میں عدل واجب ہے

مندرجہ ذیل چیزوں میں بیویوں کے درمیان عدل واجب ہے:

(۱) گھر

(۲) نفقہ

(۳) کپڑا

ضروری ہے کہ آدمی اپنی ہر بیوی پر بقدر کفایت خرچ کرے اور باری باری ان میں سے ہر ایک کے پاس رات گذارے۔[۵]

وہ امور جو خلافِ عدل نہیں ہیں

ازدواجی زندگی میں بہت سے امور ایسے پیش آتے ہیں جن کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ وہ عدل کے خلاف ہیں، لیکن جب ہم نبی کریم ﷺ کی ازدواجی زندگی پر غور کرتے ہیں تو صحیح بات واضح ہوجاتی ہے۔ ان کا تذکرہ ذیل میں کیا جارہا ہے:

۱- بیویوں میں سے جو سب سے افضل ہو اس کی تعریف کرنا:

نبی کریم ﷺ دوسری بیویوں کے مقابلے میں حضرت عائشہؓ کی تعریف کیا کرتے تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''حضرت عائشہ کی فضیلت باقی عورتوں پر اس طرح ہے جیسے ثرید کو تمام کھانوں پر فضیلت حاصل ہے''۔[۶]

۲- کسی ایک بیوی سے زیادہ محبت کا اظہار کرنا:

اللہ کے رسول ﷺ دوسری بیویوں کی بہ نسبت حضرت عائشہؓ سے زیادہ محبت کی صراحت فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ کے

رسول ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ لوگوں میں آپ کا محبوب ترین کون ہے؟ آپ نے جواب دیا: ''عائشہ''۔[۷]

۳- صاحبِ حیثیت بیوی کا ہدیہ قبول کرنا:

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، فرماتی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ زینب بنت جحش کے ہاں شہد پیا کرتے تھے اور ان کے پاس ٹھہرتے تھے۔ میں نے اور حفصہؓ نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہم میں سے جس کے پاس بھی آپ تشریف لائیں وہ کہے ''اے اللہ کے رسول ﷺ کیا آپ نے مغافیر کھایا ہے؟ مجھے تو مغافیر کی بو محسوس ہوتی ہے''۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اللہ کے رسول ﷺ جس کے پاس پہلے تشریف لے گئے اس نے ایسا ہی کہا۔ آپ نے فرمایا: نہیں! میں نے زینب بنت جحش کے ہاں شہد کھایا ہے۔ اگر اس کی وجہ سے مغافیر کی بو محسوس ہوتی ہے تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج کے بعد پھر کبھی اسے نہیں کھاؤں گا۔ اور کسی کو اس بارے میں نہ بتانا۔[۸]

یہی قصہ سورۂ تحریم کی پہلی آیت کا سبب نزول بنا۔ وہ آیت یہ ہے: يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ''اے نبی، تم کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہے؟ (کیا اس لیے کہ) تم اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو؟ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے''۔ اس طرح اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو بیویوں کی رضا کے لیے شہد اپنے اوپر حرام قرار دینے پر تنبیہ کی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کسی ایک بیوی سے ہدیہ قبول کیا جا سکتا ہے، اگر دوسری بیویاں ویسا ہدیہ دینے پر قادر نہ ہوں۔ اس میں دوسری بیویوں پر کسی طرح کی کوئی زیادتی یا ظلم نہیں ہے۔

۴- ہدیہ قبول کرنے کے لیے کسی ایک بیوی کا گھر خاص کرنا:

جس دن آں حضرت ﷺ حضرت عائشہؓ کے یہاں رہتے اس دن صحابۂ کرام اپنے ہدایا پیش کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہے کہ میری سوکنیں ام سلمہؓ کے پاس جمع

ہوئیں اورانہوں نے کہا: اے ام سلمہ! اللہ کی قسم، لوگ صرف عائشہؓ کے دن تحائف لاتے ہیں۔ہم بھی اسی طرح خیر اور عزت کی طالب ہیں، پس آپ نبی ﷺ سے کہہ دیجئے کہ لوگوں کو حکم دیں کہ آپ جہاں بھی ہوں اور جس بیوی کے گھر میں بھی ہوں، وہ ہدیہ پیش کیا کریں۔ام سلمہؓ نے نبی ﷺ سے اس کا ذکر کیا۔ام سلمہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر مجھ سے منہ موڑ لیا۔جب آپ نے دوبارہ میری طرف رخ کیا تو میں نے پھر اس کا ذکر کیا۔آپ نے پھر رخ مبارک دوسری طرف کر لیا۔ جب آپ تیسری بار میری طرف مڑے تو میں نے پھر یہی بات کہی، تب آپ نے فرمایا: ''اے ام سلمہ، عائشہ کے بارے میں مجھے تکلیف نہ دو، اس لیے کہ اللہ کی قسم، مجھ پر وحی کسی عورت کے لحاف میں نازل نہیں ہوئی سوائے اس عورت (یعنی عائشہ) کے''۔[۹]

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ شوہر کے کسی ایک خاص بیوی کے گھر میں ہدیہ قبول کرنے پر راضی ہونے میں کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہیں ہے۔اور نہ یہ لازم ہے کہ وہ لوگوں سے اس بات کا عہد لے کہ وہ اپنی بیویوں میں سے کسی کے پاس بھی ہو وہ ہدیہ پیش کیا کریں۔

۵- دوسری بیوی کے بعض حقوق سے دست بردار ہونے پر شوہر کا راضی ہونا:

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ حضرت سودہؓ کو اندیشہ لاحق ہوا کہ شاید اللہ کے رسول ﷺ ان کو طلاق دے دیں۔انہوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ مجھے طلاق نہ دیجئے، میں اپنی باری عائشہؓ کو بخشتی ہوں''۔اللہ کے رسول ﷺ نے ان کی پیش کش قبول کر لی۔[۱۰]

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ کوئی بیوی اپنے بعض حقوق سے اپنی مرضی سے دست بردار ہو جائے اور شوہر اس کو قبول کرے۔اس میں کسی قسم کی زیادتی اور ظلم نہیں ہے، بلکہ یہ صلح باہمی کا ایک حصہ ہے جس کی طرف سورۂ نساء کی آیت: ۱۲۸ میں رہ نمائی کی گئی ہے۔

۶-سفر کے سلسلے میں جس بیوی کے نام قرعہ نہ نکلے وہ قضا کی مستحق نہیں:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر کا ارادہ کرتے تو اپنی ازواج کے درمیان قرعہ اندازی کرتے۔جس کے حق میں قرعہ نکلتا اسی کو اپنے ساتھ سفر میں لے جاتے تھے۔[۱۱]

یہ حدیث بتاتی ہے کہ جس شخص کی کئی بیویاں ہوں اور وہ ان میں سے کسی کے ساتھ سفر کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کو چاہئے کہ ان کے درمیان قرعہ اندازی کرے۔جس بیوی کا نام نکلے اسی کو ساتھ لے جائے،جس طرح اللہ کے رسول ﷺ کیا کرتے تھے۔سفر سے واپسی پر شوہر کے لئے لازم نہیں کہ وہ باقی بیویوں کے ایام پورے کرے۔اس لیے کہ اللہ کے رسول ﷺ دیگر ازواج کے لئے ان دنوں کی قضا نہیں کرتے تھے۔[۱۲]

علاّمہ بغویؒ نے باقی بیویوں کے لئے عدم قضا کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ اگرچہ سفر میں ساتھ رہنے والی بیوی کو شوہر کا قرب حاصل ہوا ہے،لیکن چوں کہ وہ سفر کی مشقت سے بھی دوچار ہوئی ہے،اس لیے اس کے اور دیگر بیویوں کے درمیان،جو گھروں میں آرام سے بیٹھی تھیں،برابری کرنا انصاف نہیں ہے۔[۱۳]

کسی ایک بیوی کی طرف طبعی رغبت معاف ہے:

اللہ تعالی نے اپنے بندوں کو ان چیزوں کا مکلّف نہیں بنایا ہے جن کی وہ استطاعت نہ رکھتے ہوں۔(البقرۃ:۲۸۶) بعض لوگ ایک بیوی کی طرف زیادہ طبعی میلان رکھتے ہیں۔اس معاملے میں وہ معذور سمجھے جائیں گے۔

ابن عاشورؒ سورۃ النساء کی آیت:۱۲۹ کے ذیل میں فرماتے ہیں:اللہ تعالی کا یہ ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ محبت غیر اختیاری امر ہے،اور عورت کے ساتھ تعلقات کے کئی اسباب ہوتے ہیں جو مرد کے دل میں محبت پیدا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے پر وہ خود کو مجبور پاتا ہے۔[۱۴]

نبی کریم ﷺ دوسری بیویوں سے زیادہ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے محبت

کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہؓ سے فرمایا کرتے تھے: ''تم اپنے بارے میں کسی خوش فہمی میں نہ رہنا، اس لئے کہ تمہاری سوکن تم سے زیادہ خوب صورت اور رسول اللہ ﷺ کی سب سے زیادہ چہیتی ہے۔ ان کا اشارہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی طرف تھا''۔ ۱۵ یہ روایت نبی کریم ﷺ کی حضرت عائشہؓ سے محبت کی شہرت پر دلالت کرتی ہے۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی بیویوں کے درمیان تقسیم فرماتے تھے اور اس میں عدل سے کام لیتے تھے، اور فرماتے تھے:

اللّٰھم ھذہ قسمتی فیما أملک، فلاتلمنی فیما تملک ،ولا أملک ۱۶	اے اللہ یہ میری تقسیم ہے جس پر میں قادر ہوں اور اس چیز پر میری ملامت نہ کر جس پر تو قادر ہے اور میں قادر نہیں ہوں۔

اس حدیث کے ذیل میں علامہ بدر الدین العینیؒ لکھتے ہیں: ''نبی کریم ﷺ حضرت عائشہؓ سے باقی ازواج مطہرات کی بہ نسبت زیادہ محبت کرتے تھے اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ آدمی محبت میں کسی بیوی کو ترجیح دے، جب کہ وہ ان کے درمیان تقسیم میں برابری اختیار کرے۔ یہ بات واضح ہے کہ محبت کوئی کسبی چیز نہیں ہے۔ دل اس پر قدرت نہیں رکھتا اور اس معاملے میں عدل کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے اللہ تعالی نے اپنے بندوں سے حرج اور تنگی کو اٹھالیا ہے''۔ ۱۷

اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ اور علامہ ابن حجرؒ اس بات کے قائل ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی ایک بیوی کو کسی خاص چیز کا عطیہ دیتا ہے جو دوسری بیویوں کو نہیں دیتا تو اس میں کوئی حرج نہیں، اگر اس نے دیگر بیویوں کی ضروریات پوری کر دی ہوں۔ ۱۸

حضرت اسماءؓ سے مروی ایک حدیث سے اس بات کی تائید ہوتی ہے، فرماتی ہے: ایک عورت نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ میری ایک سوکن ہے۔ کیا میرے اوپر کوئی گناہ ہے اگر میں اس کے سامنے اپنے شوہر کی طرف سے کوئی ایسی چیز ملنے کا اظہار کروں جو اس نے مجھے نہ دی ہو۔ آپؐ نے فرمایا:

المتشبع بما لم یعط کلابس ثوبی زور. [19]	اس چیز کے ملنے کا اظہار کرنا جو نہ ملی ہو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص جھوٹا کپڑا پہنے ہو (یعنی برہنہ ہو مگر اپنے ملبوس ہونے کا دعوی کر رہا ہو۔

اس حدیث کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ اگر بیوی اس چیز کا اظہار کرے جو اس کو اپنے شوہر سے خصوصی طور پر ملی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اگر شوہر کی طرف سے بیوی کو خصوصی طور پر کوئی چیز دینا حرام ہوتا تو نبی کریم ﷺ ضرور واضح فرما دیتے۔ واللہ اعلم!

اس میں شک نہیں کہ اس طرح کے افعال بیویوں کی غیرت کو بھڑکاتے ہیں۔ اس کے باوجود شوہر کے لئے اس کی رعایت کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب نبی کریم ﷺ نے ازواج مطہراتؓ کی غیرت کی وجہ سے اپنے اوپر شہد کو حرام کر لیا تھا اور اس کا مقصد ان کی دل جوئی تھا تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ تحریم کی ابتدائی آیات میں اس پر تنبیہ فرمائی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ بیویوں کی غیرت ان چیزوں میں سے نہیں ہے جن کی رعایت کرنا شوہر کے لئے ضروری ہو، جب کہ اس کی وجہ سے ان کے حقوق پامال نہ ہو رہے ہوں۔

لیکن یہ بات بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ جس بیوی کو شوہر کی طرف سے خصوصی عطیہ ملا ہو اسے دیگر بیویوں سے اس عطیہ کو چھپانا چاہیے۔ اس سے وہ مشکلات سے محفوظ رہے گی۔

وہ امور جن کی رعایت سے مرد اور اس کی بیویاں کلی رغبت کی تلافی کر سکتی ہیں:

ذیل میں کچھ ایسے امور ذکر کئے جاتے ہیں کہ اگر شوہر اور اس کی بیویاں ان کی رعایت کریں تو امید ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی بہتر طریقے سے گذرے گی اور شوہر کا کسی ایک بیوی کی طرف جھکاؤ بھی نہیں ہوگا۔

(الف) وہ امور جن کی رعایت کرنا شوہر کے لئے ضروری ہے۔

ا۔ آدمی تعدد ازدواج کے ارادے کے وقت ہی عدل وانصاف کی اپنے اندر

ذہنیت بنائے۔

۲۔اگر اس کو ایک سے زائد نکاح کرنے کی صورت میں کسی ایک بیوی کی طرف جھکاؤ اور دوسری بیوی پر ظلم کا اندیشہ ہو تو ایک سے زائد شادی نہ کرے۔

۳۔ان اقدامات کو برداشت کرے جن کی بنیاد غیرت پر ہو اور ان جیسے واقعات کو نظر انداز کرے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی سنت مبارکہ سے ثابت ہے۔حضرت انسؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ اپنی کسی ایک بیوی کے گھر میں تھے۔اسی اثنا میں امہات المومنین میں سے کسی نے کھانے کا ایک پیالہ بھیجا۔جس بیوی کے گھر میں آپ تھے اس نے خادم کے ہاتھ پر مارا جس کی وجہ سے پیالہ گر کر ٹوٹ گیا۔نبی کریم ﷺ نے ان ٹکڑوں کو جمع کیا اور اس میں وہ کھانا بھرنا شروع کیا اور فرمایا: ''تمہاری ماں کو غیرت آ گئی''۔پھر دوسرا پیالہ منگا کر خادم کے ہاتھ واپس بھیج دیا۔[۲۰]

۴۔سوکنوں کے ایسے آپسی جھگڑوں میں، جو غیرت کا سبب بنتے ہیں، کسی ایک کا طرف دار اور حامی نہ بنے۔نبی کریم ﷺ ایسا ہی کرتے تھے۔حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ میرے گھر میں تھے۔زینب بنت جحش آئیں۔انھوں نے گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کی۔آپ نے اجازت دے دی۔انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ آپ کی ازواج نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے، وہ آپ سے ابوقحافہ کی بیٹی (مراد حضرت عائشہؓ) کے بارے میں عدل کا مطالبہ کر رہی ہیں۔حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ اس کے بعد زینب مجھے سخت سست کہنے لگیں۔میں اللہ کے رسول ﷺ کی طرف دیکھ رہی تھی اور آپ کے اشارے کا انتظار کر رہی تھی کہ کیا آپ مجھے اس معاملے میں کچھ کہنے کی اجازت دیتے ہیں؟ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ زینبؓ برابر مجھ سے جھگڑتی رہیں، یہاں تک کہ میں سمجھ گئی کہ اگر میں بھی کچھ کہوں تو آپ ﷺ اس کو ناپسند نہیں فرمائیں گے، چنانچہ میں نے بھی انھیں ترکی بہ ترکی جواب دینا شروع کیا اور انھیں کچھ کہنے کی مہلت نہ دی۔یہ دیکھ کر اللہ کے رسول ﷺ نے ہنستے ہوئے فرمایا: یہ ابوبکر کی بیٹی ہے۔[۲۱]

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان دونوں

بیویوں کے جھگڑے کے دوران ان کے بیچ مداخلت نہیں کی، بلکہ اس کے ٹھنڈا پڑنے کے بعد مظلومہ کی تائید کی۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں: ''نبی ﷺ کی نو بیویاں تھیں۔آپ ہر ایک کے پاس رات گذارتے تھے۔اس طرح ہر ایک کا نمبر نو دنوں کے بعد آتا تھا۔اس لئے ازواج مطہرات ہر رات کو اس زوجۂ مطہرہ کے گھر جمع ہوتی تھیں جس کے یہاں آپ کو رات گذارنی ہوتی تھی۔ایک روز حضرت عائشہؓ کی باری تھی، اس دن کسی بات پر حضرت عائشہؓ اور حضرت زینبؓ آپس میں لڑنے لگیں۔اسی اثنا میں نماز کا وقت ہو گیا۔حضرت ابوبکرؓ کا وہاں سے گذر ہوا اور انہوں نے ان کی آوازیں سنی، انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ نماز کے لیے چلئے اور ان عورتوں کے منہ میں مٹی بھر دیجئے۔جب نبی کریم ﷺ نماز کے لیے نکلے تو حضرت عائشہؓ نے کہا: اب تو نماز کے بعد میرے والد آکر میری سرزنش کریں گے''۔ ۲۲

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان دو سوکنوں کے بیچ مداخلت نہیں کی، یہ جانتے ہوئے کہ اس کی بنیاد غیرت اور حمیت ہے۔

۵۔بیویوں کے درمیان عدل قائم کرنے کے سلسلے میں اپنے اندر قوت ارادی پیدا کرے اور ان وعیدوں اور تنبیہات کو ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھے جو اس شخص کے متعلق وارد ہوئی ہیں جو اپنی بیویوں میں سے کسی بیوی کی طرف کلی میلان اور جھکاؤ رکھتا ہو۔

۶۔ہر وقت اللہ سے دعا کرتا رہے کہ وہ اسے بیویوں کے درمیان عدل کرنے کی توفیق دے۔

(ب) وہ امور جن کی رعایت کرنا بیویوں کے لئے ضروری ہے:

کسی شخص کی ایک سے زائد بیویاں ہوں تو ہر بیوی کو درج ذیل امور کی رعایت کرنی چاہئے:

ا۔شوہر کے ساتھ حسن معاشرت سے پیش آئے اور اس سے بہت زیادہ محبت کرے۔

۲۔ بہت زیادہ مطالبات اور شکایات کر کے شوہر کو پریشان نہ کرے، ورنہ وہ اس سے نفرت کرنے لگے گا اور دوسری بیوی کی طرف مائل ہو جائے گا۔

۳۔ شوہر کو جس بیوی سے زیادہ محبت ہو اس کے بارے میں اسے کوئی تکلیف پہنچانے اور پریشان کرنے سے گریز کرے۔

۴۔ جب شوہر اس کے علاوہ دوسری بیوی کے پاس ہو تو شوہر کو تکلیف دینے اور اس کی زندگی کو اجیرن بنانے سے باز رہے۔

۵۔ اپنے شوہر کے ساتھ حسن ظن رکھے اور بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے اس پر دوسری بیوی کی طرف زیادہ جھکاؤ کا الزام نہ لگائے۔

جب مرد کو کسی بیوی سے رغبت نہ رہے، اس وقت اس بیوی کو اختیار دینا:

اگر کسی شخص کی کئی بیویاں ہوں اور وہ اپنے اندر کسی ایک کی جانب جھکاؤ محسوس کرے اور بیویوں کے درمیان واجب عدل قائم رکھنے سے عاجز ہو جائے تو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ اس بیوی کو جس سے اب رغبت نہیں رہی ہے، اس بات کا اختیار دے کہ چاہے تو طلاق لے لے اور چاہے تو شوہر کی رغبت ختم ہو جانے کے باوجود ازدواجی زندگی میں شریک رہے۔ اگر عورت شوہر کے ساتھ رہنے کو ترجیح دے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ تفریق اور جدائی سے بہتر ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِن بَعْلِهَا نُشُوزاً أَوْ إِعْرَاضاً فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحاً وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَأُحْضِرَتِ الأَنفُسُ الشُّحَّ وَإِن تُحْسِنُواْ وَتَتَّقُواْ فَإِنَّ اللّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (النساء:۱۲۸)

اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کہ میاں اور بیوی (کچھ حقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کر لیں۔ صلح بہر حال بہتر ہے۔ نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں، لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو کہ اللہ تمہارے اس طرز عمل سے بے خبر نہ ہوگا۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتی ہیں: کہ کوئی شوہر اپنی بیوی میں کوئی ایسی چیز دیکھے جو اس کو پسند نہ ہو، چاہے وہ بڑھاپا ہو یا کوئی دوسری چیز، اور وہ اس سے جدائی چاہتا ہو، اس صورت میں بیوی کہے کہ آپ مجھے روکے رکھیں اور طلاق نہ دیں، آپ کو اختیار ہے کہ میری باری مقرر کریں یا نہ کریں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں اگر وہ دونوں اس بات پر راضی ہو جائیں۔۲۳

حضرت رافع بن خدیجؓ سے روایت ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ ان کی بیوی عمر دراز ہو چکی تھی۔ انہوں نے دوسری شادی ایک نوجوان لڑکی سے کی اور اس کو بوڑھی عورت پر ترجیح دی (یعنی اس کی طرف زیادہ توجہ دینے لگے)۔ اس پر پہلی بیوی نے زوجیت میں رہنے سے انکار کیا۔ چنانچہ انہوں نے اسے ایک طلاق دے دی۔ جب اس کی عدت پوری ہونے میں تھوڑے دن رہ گئے تو انہوں نے اس مطلقہ بیوی سے کہا کہ اگر پسند کرو تو میں رجوع کر لوں اور چاہو تو رجوع نہ کروں، یہاں تک کہ تمہاری عدت ختم ہو جائے؟ اس نے کہا: رجوع کر لیجئے، میں صبر کروں گی۔ چنانچہ انہوں نے رجوع کر لیا۔ لیکن پہلی بیوی صبر نہ کر سکی اور اس نے طلاق کا مطالبہ کیا، چنانچہ انھوں نے اسے دوسری طلاق دے دی۔۲۴

خلاصۂ کلام:

۱۔ اسلام نے انسانی مزاج کی رعایت کی ہے۔ اللہ تعالی نے اپنے بندوں پر بقدر طاقت بوجھ ڈالا ہے اور جن چیزوں پر وہ قدرت نہیں رکھتے ان میں انہیں معذور سمجھا ہے۔

۲۔ اسلام نے ازدواجی تعلقات سے پوری دل چسپی لی ہے اور ان حدود کی وضاحت کی ہے جن سے تجاوز کرنا زوجین میں سے کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔

۳۔ تعدد ازواج کی صورت میں مرد پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ تمام بیویوں کے درمیان عدل و انصاف سے کام

لے۔جوشخص ایسانہ کرے،اس کے لئے ایک سے زائد نکاح جائز نہیں۔

۴۔شوہر جس عدل کا مکلّف ہے اس کا تعلق ان کاموں سے ہے جنہیں وہ انجام دے۔اس کا تعلق اس فضل واکرام سے نہیں ہے جس کا مظاہرہ اس کی کسی بیوی کی جانب سے ہو۔اسی طرح اس کا تعلق اس اعزاز وتکریم سے بھی نہیں ہے جس کا مظاہرہ اس کے دوست واحباب کی جانب سے اس کی بعض بیویوں کے تعلق سے ہو۔

۵۔تعدد ازواج سے یہ لازم نہیں آتا کہ بہ ہرصورت شوہر کا کسی ایک بیوی کی طرف کلی میلان ہوجائے،جیسا کہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں۔

حواشی ومراجع

۱۔ ابوداؤد، کتاب الادب،باب فی فضل من عال یتیما،حدیث نمبر:۵۱۴۷

۲۔ بخاری، کتاب الادب،باب البر و الصلة، حدیث نمبر :۲۵۴۸

۳۔ محاسن التاویل:۱۵۹۸/۵۔۱۵۹۹،وتفسیر المراغی:۱۷۳/۵

۴۔ ابوداؤد، کتاب النکاح،باب فی القسم بین النساء، حدیث نمبر:۲۱۳۳

۵۔ أحکام القرآن لابن العربی:۳۱۵/۱،وأضواء البیان:۴۲۵/۱۔۴۲۶

۶۔ بخاری، کتاب فضائل الصحابة،باب فضل عائشة، حدیث نمبر:۳۷۷۰

۷۔ ترمذی، کتاب المناقب،باب فضل عائشة، حدیث نمبر:۳۸۸۵

۸۔ بخاری، کتاب التفسیر،باب:﴿یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ﴾، حدیث نمبر:۴۹۱۲

۹۔ بخاری، کتاب فضائل الصحابة،باب فضل عائشة، حدیث نمبر:۳۷۷۵

۱۰۔ ترمذی، کتاب التفسیر،باب من سورة النساء، حدیث نمبر:۳۰۴۰

۱۱۔ بخاری، کتاب الهبة،باب هبةالمرأةلغیر زوجه، حدیث نمبر:۲۵۳۹

۱۲۔ زادالمعاد:۱۵۱/۵۔۱۵۲

۱۳۔ شرح السنة:۱۵۴/۹

۱۴۔ التحریر والتنویر:۲۱۸/۵

۱۵ بخاری، کتاب النکاح،باب موعظة الرجل بنته لحال زوجها، حدیث نمبر:۵۱۹۱،

۱۶ ترمذی، کتاب النکاح،باب ما جاء فی التسویة بین الضرائر، حدیث نمبر:۱۱۴۰

۱۷ عمدۃ القاری:۲۰/۲۰۳

۱۸ المغنی:۱۰/۲۴۲، فتح الباری:۹/۲۲۴

۱۹ بخاری، کتاب النکاح،باب المتشبع لما لم ینل وما ینهی عن افتخار الضرة، حدیث نمبر:۵۲۱۹

۲۰ بخاری، کتاب النکاح،باب الغیرة، حدیث نمبر:۵۲۲۵

۲۱ بخاری، کتاب الهبة، باب من أهدی الی صاحبه وتحری بعض نسائه دون بعض، صحیح مسلم ، کتاب فضائل الصحابة ، باب فضل عائشة، حدیث نمبر:۲۵۸۱

۲۲ مسلم، کتاب الرضاع،باب القسم بین الزوجات و بیان أن من السنة أن تکون لکل واحدة لیلة مع یومها، حدیث نمبر:۱۴۶۲

۲۳ بخاری، کتاب الصلح،باب قول الله:﴿أَن يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحاً وَالصُّلْحُ خَيْرٌ﴾، حدیث نمبر:۲۶۹۴

۲۴ موطا امام مالک، کتاب النکاح،باب جامع النکاح، حدیث نمبر:۵۹

تحقیقاتِ اسلامی کی توسیع اشاعت کے لیے ایک خصوصی اسکیم

۱- جو حضرات چار سال کا زرتعاون چار سو روپے (-/۴۰۰) یک مشت ادا کریں گے انھیں رسالہ پانچ سال تک بھیجا جائے گا۔

۲- جو حضرات رسالہ کے چار خریدار جتنی مدت کے لیے بنائیں گے، اتنی مدت تک انھیں بھی رسالہ اعزازی طور پر بھیجا جائے گا۔

صفحات:۱۲۰ زرِتعاون: فی شمارہ:۲۵ روپے، سالانہ:۱۰۰ روپے

پتہ: ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ

Mob: 09412562972 Email: tahqeeqat_islami@yahoo.com , tahqeeqateislami@gmail.com

تعارف وتبصرہ

اردو تفاسیر بیسویں صدی میں ڈاکٹر سید شاہد علی

ناشر: کتابی دنیا، ۱۹۵۵-ٹی، گیٹ دہلی-۶، صفحات: ۱۹۹، قیمت: ۳۵۰ روپے

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ آخری محفوظ کتاب ہے، جو ساری انسانیت کو تا قیامت ہدایت کی راہ دکھاتا ہے، بلکہ دنیا و آخرت میں انسانوں کی کامیابی ونجات کا انحصار اسی کتاب پر عمل میں ہے۔ اس اہمیت کے پیشِ نظر قرآن ہمیشہ مسلمانوں کا مرکزِ توجہ رہا ہے اور اس کی تفہیم وتفسیر کے سلسلے میں ان کی زبردست کاوشیں تحریری شکل میں موجود ہیں۔ قرآن عربی مبین میں نازل ہوا۔ اس کے نزول سے لے کر اب تک ہزاروں عربی تفاسیر لکھی گئیں، اس کے علاوہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں قرآن کے تراجم اور تفاسیر لکھی گئیں تا کہ اللہ تعالیٰ کے اس آخری پیغام سے انسانیت محروم نہ رہ جائے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں بیسویں صدی عیسوی میں لکھی جانے والی اردو تفاسیر کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی بخوبی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ علماء نے قرآن کے ساتھ اردو زبان کو کمیت وکیفیت کے اعتبار سے کسی قدر ترقی دی اور آگے بڑھایا ہے۔

یہ کتاب چار ابواب میں منقسم ہے۔ باب اول کا عنوان ہے ''مکمل تفسیریں'' اس میں چھبیس مکمل تفاسیر کا تعارف کرایا گیا ہے۔ باب دوم جزوی تفاسیر کے عنوان سے ہے۔ اس میں سینتیس نامکمل تفاسیر کی تفصیل درج ہے۔ باب سوم میں چار ''تفسیری حواشی'' کا تعارف کرایا گیا ہے۔ جن کے ذریعہ قرآن کے معنی ومفہوم کی تشریح وتوضیح کی کوشش کی گئی ہے۔ باب چہارم حوالہ جات پر مشتمل ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں ہر تفسیر کے تعارف کا یہ منہج اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے پیراگراف میں اس تفسیر کا سن اشاعت، جلدیں، ناشر، تفسیر لکھنے کا پس منظر اور تفسیری نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے پیراگراف میں اس تفسیر کی اہمیت وافادیت اور دیگر تفاسیر کے مقابلے میں

اس کا مقام ومرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ مذکورہ تفسیر کس نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے؟ اور کس مکتبہ فکر کی ترجمانی کرتی ہے؟۔ آخری پیراگراف میں مذکورہ تفسیر پر مختصر تبصرہ ہے، بعض مشہور ومتداول تفاسیر کا نسبتاً تفصیل سے تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ کتاب دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔ کتابت وطباعت مناسب ہے، البتہ پروف کی غلطیاں خاصی موجود ہیں۔ فی الجملہ کتاب اس لائق ہے کہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے۔ البتہ اردو خواں طبقہ کے ذوق مطالعہ کے پس منظر میں کتاب کی قیمت عام آدمی کی دست رس سے باہر ہے۔

(محمد جرجیس کریمی)

قرآن کریم میں معرّب الفاظ — ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی

ناشر: دارالعلوم جائس، جائس، رائے بریلی، ۲۰۰۶ء صفحات ۲۱۵، قیمت -/۱۰۰ روپے

معرّب سے مراد غیر عربی زبان کا وہ لفظ ہے جسے اہل عرب نے استعمال کیا ہو۔ کیا قرآن کریم میں معرّب الفاظ پائے جاتے ہیں؟ بالفاظ دیگر کیا اس میں کچھ ایسے الفاظ ہیں جن کی اصل غیر عربی ہو؟ یہ مسئلہ زمانۂ قدیم سے علماء کے درمیان بحث ونقاش کا موضوع رہا ہے۔ ایک گروہ شدّت سے اس کا انکار کرتا ہے، جب کہ دوسرا اس کا قائل ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) کا تعلق موخر الذکر گروہ سے ہے۔ ان کی مشہور کتاب 'الاتقان فی علوم القرآن' کی اڑتیسویں فصل اسی موضوع پر ہے: 'ماوقع فی القرآن بغیر لغۃ العرب'' (قرآن میں جو الفاظ غیر عربی زبان کے ہیں) اس کے علاوہ ان کی ایک مستقل کتاب ہے جس کا عنوان ہے: ''المہذّب فی ماوقع فی القرآن من المعرّب' اس میں انہوں نے حروف ہجاء کی ترتیب پر ایسے الفاظ جمع کردیے ہیں۔ اس موضوع پر ان کی ایک دوسری کتاب 'المتوکلی' ہے جسے انہوں نے خلیفہ متوکل علی اللہ (م ۹۰۳ھ) کی فرمائش پر لکھا تھا، اس میں انہوں نے قرآن مجید میں وارد ۱۲۴/معرّب الفاظ کا ذکر کیا ہے جو گیارہ مختلف زبانوں کے ہیں۔ وہ زبانیں یہ ہیں: حبشی، فارسی، رومی، ہندوستانی، سریانی، عبرانی، نبطی، قبطی، ترکی، زنجی

اور بربری۔اس کتاب کی ترتیب زبانوں کے اعتبار سے ہے۔

زیرنظر کتاب علامہ سیوطی کی اس موخرالذکر کتاب 'المتوکلی' کی تدوین، تخریج اور ترجمہ پر مبنی ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں، پہلے حصے میں مصنف، موضوع اور تصنیف کا تعارف کرایا گیا ہے، پھر زبانوں میں مستعار الفاظ کے مطالعہ کی علمی وتاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ حاشیہ میں آیات، احادیث اور کتاب میں وارد روایات کی امام سیوطی کی تفسیر الدرالمنثور سے تخریج کی گئی ہے اور متن میں وارد شخصیات اور کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں المتوکلی کا عربی متن درج کیا گیا ہے، پھر کتاب میں مذکور معرّب الفاظ کا حروف تہجی کے اعتبار سے اشاریہ دیا گیا ہے، نیز کتاب میں وارد شخصیات کی بھی فہرست پیش کی گئی ہے۔

فاضل مترجم کے پیشِ نظر المتوکلی کا صرف وہ نسخہ رہا ہے جو دارالکتب المصریۃ قاہرہ میں ہے، دیگر نسخے حاصل کرکے وہ ان کا تقابل نہیں کرسکے ہیں۔ دوران تخریج جو روایات انہیں الدرالمنثور میں نہیں ملیں ان کی صراحت کردی ہے، انہیں امام سیوطی کی دیگر تحریروں میں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، امام سیوطی نے کتنے معرّب الفاظ کو قرآن کریم میں مذکور قرار دیا ہے ان کی تعداد ایک جگہ (ص ۵۷) ۱۳۴/اور دوسری جگہ (ص ۵۰) ۱۲۶ لکھی ہے، جب کہ اشاریہ ۱۲۵/الفاظ کا تیار کیا ہے، جس میں لفظ 'کنائس' کے ضمن میں لکھا ہے کہ 'یہ قرآنی لفظ نہیں ہے'۔

یہ کتاب قرآنیات کے ایک اہم موضوع سے متعلق ایک وقیع تصنیف کو جدید علمی انداز میں پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ امید ہے علمی حلقوں میں اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

برصغیر ہند میں اشاعت اسلام کی تاریخ — مفتی محمد مشتاق تجاروی

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔ ۲۰۰۶ء، صفحات: ۱۶۴، قیمت -/۷۵ روپے

ہندوستان میں عہد اسلامی کی تاریخ پر یوں تو بہت سے تحقیقی کام ہوئے ہیں، لیکن کوئی ایسا قابل ذکر مستند اور تحقیقی کام اب تک منظر عام پر نہیں آیا ہے جس میں برصغیر ہند میں

اشاعت اسلام کی تاریخ پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہو۔ ہندوستان میں اسلام کی آمد کب اور کیسے ہوئی؟ اشاعتِ اسلام میں سماج کے کن طبقات نے حصہ لیا؟ کیا یہاں کے باشندوں کی بہت بڑی تعداد نے مسلم حکم رانوں کے جبر سے اسلام قبول کیا؟ ضرورت تھی کہ مستند تاریخی مراجع کی روشنی میں اس موضوع کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے، جس سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہوتیں اور حقیقت نکھر کر سامنے آتی۔ زیرنظر کتاب کے ذریعے، اختصار کے ساتھ ہی سہی، اس ضرورت کی تکمیل کی کوشش کی گئی ہے۔

فاضل مصنف کا کہنا ہے کہ چار طبقات نے اشاعت اسلام میں اپنا حصہ ادا کیا ہے: صوفیہ، علماء، سلاطین اور تجّار۔ چنانچہ کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب میں ایک طبقہ کی تبلیغی خدمات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر طبقہ کی شخصیات کا تذکرہ نام بہ نام کیا گیا ہے۔ مصنف کے پیش نظر عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کے بنیادی اور ثانوی دونوں طرح کے مراجع رہے ہیں۔ انہوں نے ہر واقعہ کا حوالہ دیا ہے اور ہر نتیجۂ بحث کو مورخین کے بیانات سے مؤکد کیا ہے۔

کتاب میں سب سے زیادہ مفصّل بحث مسلم سلاطین پر ہے، اس سے کم صوفیہ، اس سے کم علماء اور سب سے کم بحث تجّار کی خدمات کے متعلق ہے (صرف ۱۶ صفحات)۔ گویا اہمیت کے پیش نظر جس طبقہ کی خدمات کو سب سے زیادہ اجاگر کرنے اور اس کی جزئی معلومات فراہم کرنے کی ضرورت تھی اسی پر سب سے کم توجہ دی گئی ہے۔ صوفیہ کی تبلیغی خدمات کے ضمن میں بھی تنقیح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جابجا اشاعت اسلام کو ان کے کشف و کرامات کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر مضامین کی تکرار ملتی ہے، مثلاً ص ۲۵، ۲۶ کے اقتباسات ص ۳۹، ۴۰، ۵۹، ۱۱۱ پر بھی موجود ہیں۔ شخصیات کے ذیل میں کہیں کہیں ضمنی طور پر دیگر شخصیات کا ذکر آ گیا ہے۔

زیرنظر کتاب برصغیر میں اشاعت اسلام کی تاریخ کے مختلف گوشوں کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ اپنے موضوع پر ایک مفید اور اہم علمی کاوش ہے، اس پر فاضل مصنف مبارک باد کے مستحق ہیں۔ (م۔ر۔ن)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی — مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

عہد ساز شخصیت، مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں

ناشر: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۲۰۰۷ء، طبع دوم، ص ۳۶۰، قیمت -/۱۲۰ روپے

عصر حاضر میں اسلام کے عظیم داعی اور مفکر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی حیات اور خدمات پر ان کی زندگی کے آخری ایام ہی میں متعدد کتابیں منظر عام پر آ گئی تھیں۔ پھر ان کی وفات کے فوراً بعد متعدد دینی، علمی اور ادبی رسائل و جرائد نے خصوصی نمبر نکالے، یونیورسٹیوں نے سمینار منعقد کیے، ریسرچ اسکالرس نے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی مقالے لکھے اور اردو، عربی، فارسی، بنگالی اور دیگر زبانوں میں، ملک اور بیرونِ ملک میں کتابیں شائع ہوئیں اور اس کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ لیکن زیر نظر کتاب کی نوعیت ان سب سے مختلف ہے۔ اس لیے کہ اسے مولانا مرحوم کے بھانجے، پروردہ اور جانشین مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں تحریر کیا ہے۔ مولانا محمد واضح رشید ندوی نے بجا طور پر اس کتاب کی اہمیت یوں بیان کی ہے: ''حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب بچپن سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت میں رہے اور اس کے بعد مولانا سے ان کا قریبی تعلق رہا، ان کے اسفار میں ان کے مرافق رہے اور ندوۃ العلماء اور دوسرے اداروں اور تحریکوں میں مولانا کے مشیر اور معاون رہے۔ حضرت مولانا کو ان پر جتنا اعتماد تھا وہ دوسری کسی شخصیت کو حاصل نہیں تھا۔ اس لیے ان کی یہ تصنیف وثائقی حیثیت رکھتی ہے، اس کی حیثیت ایک مشاہد کے بیان کی ہے، اس میں فکر یا مطالعہ سے زیادہ تجربہ اور مشاہدہ کا عنصر پایا جاتا ہے'' (ص ۷)

یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں حالاتِ زندگی کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے، باب دوم میں تعلیم و تربیت اور شخصیت کی تشکیل میں کارفرما اسباب اور عوامل پر روشنی ڈالی گئی ہے، باب سوم میں عملی زندگی اور جدو جہد کے مختلف پہلو (دینی دعوت، اصلاح معاشرہ، قائدین ملک وملت اور ممالک اسلامیہ کے زعماء کو مشورے اور نظام تعلیم و تربیت کی اصلاح) زیر بحث آئے ہیں۔ باب چہارم میں مختلف تحریکوں اور اداروں سے

مولانا مرحوم کے تعلق اور ان میں ان کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب پنجم میں بیرون ملک مولانا کے اسفار اور باب ششم میں ان کے تحریری و تصنیفی سرمایہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

مصنف محترم نے اپنی مصروفیات کی بنا پر یہ کتاب املا کرائی ہے۔ ان کے نواسے مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی نے ان کے فرمودات کو ضبط تحریر میں لانے کے ساتھ مختلف موضوعات کے تحت ان کو مرتب و مدوّن بھی کیا ہے۔ اسی بنا پر بہت سی باتوں کی تکرار ملتی ہے جسے ختم نہیں کیا جاسکا ہے۔ امید ہے، دعوت و اصلاح، تعلیم و تربیت اور سیاست و قیادت سے تعلق رکھنے والے ہر طبقہ میں اس کتاب کی افادیت محسوس کی جائے گی۔ (م-ر-ن)

عظمت کے نشان

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ناشر: ادب کدہ، مہراج پور، انور گنج، اعظم گڑھ، صفحات ۲۹۶، قیمت -/۲۰۰ روپے

زیرِ نظر کتاب چند شخصیتوں کے علمی و ادبی جائزہ اور سوانحی خاکوں پر مشتمل ہے۔ یہ شخصیات اسلامیات، ادب، صحافت اور دیگر میدانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ علومِ اسلامی کے میدان میں شہرت رکھنے والی جن مشہور شخصیات کا تذکرہ اس میں شامل ہے وہ ہیں: سرسید، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید ابوظفر ندوی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا صدرالدین اصلاحی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مجیب اللہ ندوی۔ ان مضامین کے بارے میں ڈاکٹر عمیر الصدیق ندوی کا یہ کہنا بجا ہے کہ مضمون نگار نے ''ان میں اپنی ممدوح شخصیتوں کی صرف مداحی نہیں کی ہے، بلکہ ان کے کارناموں کی قدر و قیمت سے بحث کی ہے، اس کے لیے انھوں نے معروضی مطالعہ و جائزہ سے کام لیا ہے''۔ (ص ۱۶)

یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے اور ملک و بیرون ملک کے مؤقر علمی مجلّات میں شائع ہو کر علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے تھے۔ اب انھیں کتابی صورت میں جمع کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس کی بھی علمی و ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔ (م-ر-ن)

خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی

☆ صدرِ ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری ۱۹۹۰ء سے جماعت اسلامی ہند کے نائب امیر چلے آرہے تھے۔ اپریل کے پہلے ہفتے میں جماعت کی مجلسِ نمائندگان نے آئندہ میقات (اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۱۱ء) کے لیے انھیں جماعت کا کل ہند امیر منتخب کرلیا۔ قارئینِ تحقیقات اسلامی سے درخواست ہے کہ وہ مولانا کے حق میں دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں مفوّضہ ذمہ داری کو کماحقّہ انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے، ساتھ ہی ان کی علمی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔

☆ 'اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور' مولانا عمری کی مقبول کتابوں میں سے ہے۔ ادارۂ تحقیق سے اس کے دو ایڈیشن منظر عام پر آئے تھے۔ حال میں اضافہ اور نظر ثانی کے بعد اس کا تازہ ایڈیشن کمپیوٹر کتابت کے ساتھ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی نے شائع کیا ہے، صفحات :۱۸۴، قیمت -/۸۰ روپے (پیپر بیک) -/۱۱۰ روپے (مجلد مع ڈسٹ کور) اس سے قبل مولانا کی مقبولِ عام کتاب 'اسلام کی دعوت' کا نیا ایڈیشن بھی مکتبہ نے شائع کیا تھا۔ صفحات :۳۴۴، قیمت -/۱۳۰ روپے۔

☆ ادارے کے تصنیفی تربیت کورس سے ان دنوں تین نوجوان فضلاء وابستہ ہیں، ادارہ انھیں رہائش کی سہولت فراہم کرنے کے ساتھ دو ہزار ماہانہ اسکالرشپ بھی دیتا ہے۔ 'رائٹرس فورم' کے تحت ان اسکالرس کا پیپر ریڈنگ کا ماہانہ پروگرام پابندی سے ہورہا ہے، جس میں ادارۂ علوم القرآن علی گڑھ کے اسکالرس اور مسلم یونیورسٹی کے بعض باذوق طلبہ بھی شریک ہوتے ہیں۔ ۲۷/ فروری ۲۰۰۷ء کو جناب زبیر عالم اصلاحی نے، ۲۸/ مارچ ۲۰۰۷ء کو جناب سراج احمد برکت اللہ فلاحی نے اور ۲۵/ اپریل ۲۰۰۷ء کو جناب مجاہد شبیر احمد فلاحی قاسمی نے، بالترتیب ترجمۂ موضح القرآن- ایک مطالعہ، ہجری تقویم - تاریخ اور اہمیت اور اتحادِ ملت - ضرورت اور تقاضے کے عنوانات پر مقالات پیش کیے۔ یہ پروگرام مسلم یونیورسٹی کے بعض موقر اساتذہ کی نگرانی میں ہوئے اور ان پر بحث ومباحثہ بھی ہوا۔

☆ مولانا عمری امیر جماعت اسلامی ہند منتخب ہونے کے بعد، ۵/مئی کو پہلی مرتبہ علی گڑھ

آئے، تو سب سے پہلے ادارۂ تحقیق تشریف لائے۔ کارکنانِ ادارہ کے ساتھ ایک نشست کر کے ان کی علمی سرگرمیوں اور ادارہ کے انتظامی امور کا جائزہ لیا۔ اس کے علاوہ ادارہ کے زیرِ تربیت اسکالرس کے ساتھ ایک خصوصی ملاقات میں انھیں اسلامیات میں مطالعہ وتحقیق کے سلسلہ میں مفید مشورے دیے۔

☆ جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ شمالی ہند کی ایک ابھرتی ہوئی درس گاہ ہے جس کے بانی وسرپرست مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری ہیں۔ اس کے تحقیقی ادارہ مرکز الشیخ ابی الحسن الندوی للبحوث والدراسات الاسلامیہ کے زیر اہتمام 'ہندوستان اور علم حدیث- تیرہویں اور چودھویں صدی ہجری میں' کے موضوع پر ۲۱-۲۲/ مارچ ۲۰۰۷ء میں دوروزہ بین الاقوامی مذاکرۂ علمی منعقد ہوا۔ ادارہ کے رکن ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے اس میں شرکت کی اور 'مولانا محمد یوسف بنوری (۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء-۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء) کی خدماتِ حدیث - ان کی تصنیف معارف السنن شرح جامع الترمذی کی روشنی میں' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

مقالہ نگار حضرات سے گزارش

۱- تحقیقاتِ اسلامی میں صرف غیر مطبوعہ مقالات شائع کیے جاتے ہیں، اس لیے جو مقالہ اس میں اشاعت کے لیے بھیجیں اسے کسی دوسرے رسالے میں ہرگز نہ بھیجیں۔

۲- اگر تحقیقاتِ اسلامی میں کسی مقالہ کی کسی وجہ سے اشاعت ممکن نہ ہوگی تو اس کی اطلاع کردی جائے گی۔ سہ ماہی رسالہ ہونے کی وجہ سے عموماً مقالہ نگاروں کو زحمت انتظار برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اس پر ہم معذرت خواہ ہیں۔

۳- فوٹو اسٹیٹ کاپی میں بسا اوقات بعض الفاظ یا حروف مٹ جاتے ہیں۔ اس لیے براہ کرم مقالہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس محفوظ رکھیں اور اصل کاپی روانہ کریں۔

۴- مقالہ خوش خط، ورق کے ایک جانب، صفحہ کے دونوں طرف حاشیہ چھوڑ کر لکھا جائے۔ بہتر ہے کہ اسے کمپیوٹر کتابت کے ساتھ بھیجا جائے۔ کمپیوٹر کتابت کی صورت میں ای میل کے ذریعے بھی بھیجا جاسکتا ہے، ادارہ کا ای میل ایڈریس یہ ہے:

tahqeeqateislami@gmail.com + tahqeeqat_islami@yahoo.com